ادب اور آرٹ کا حسین ترین امتزاج

شعور

مکتبۂ شعور کراچی

مانڈوی والا لین - پریڈی سٹریٹ - صدر - کراچی

ترتیب و پیشکش

آذر زوبی

اس شمارے میں

کہانی
افسانہ
داستان
ہزار داستان

سعادت حسن منٹو
●
کرشن چندر
●
عصمت چغتائی
●
قدرت اللہ شہاب
●
احمد ندیم قاسمی
●
بلونت سنگھ
●
ہاجرہ مسرور
خدیجہ مستور
●
ابوالفضل صدیقی

اردو افسانہ نگاری کے
رجحانات
●
مجتبیٰ حسین





یہ خاکہ کتاب بھی ہے اور صاحب کتاب بھی - کتاب جس کو طلسم زندگی کہیں اور صاحب کتاب ایک جہاندیدہ فن کار، جس کے چہرے پر فراست کی سنجیدگی اور آنکھوں میں تفکر کی گہرائی ہے۔

اوپر کا حصہ کتاب کے اوراق بھی ہیں اور ایک فنکار کا ذہن بھی جو حکمت و دانش کا مخزن ہے - سیاہ حصہ کتاب کی جلد بھی ہے اور تحت الشعور بھی - جس میں صدیوں کا تہذیبی ورثہ، نئے قالب میں ڈھلنے کے لئے بے قرار ہے - یہ ورثہ، وہ گراں بہا سرمایہ ہوتا ہے جس سے فنکار نئے خیالوں کی کشید کرتا ہے - اور ان میں اپنے خون جگر کو شامل کر کے ایک نئے نادر اور منفرد پیکر کی تشکیل کرتا ہے۔

خاکہ کے اوپر مصرع عرب کے سرآمد شعراء المتنبی کا ہے۔

پورا شعر یہ ہے — و اعز مکان فی الدنیا سرج سابح
و خیر جلیس فی الزمان کتاب

کہ اس خائن زمانے میں سب سے اچھی مسند سمند باد پا کی زین ہے اور سب سے اچھا دوست روزگار میں کتاب ہے۔

طغریٰ ڈیزائن ● آزر زوبی



مجسمہ ماں اور بچہ

از

آذر زوبی

سر ورق

صغرا ربابی

ترتیب

اهل شعور سے

شعور کا ایک اور شمارہ حاضر خدمت ہے ۔ ارادہ تھا اور اعلان بھی کیا جا چکا تھا کہ شعور کا آیندہ شمارہ کہانی نمبر ہو گا ۔ چنانچہ اس سلسلے میں تیاریاں بھی کی جا چکی تھیں ۔ پاکستان اور ہندوستان کے تقریباً تمام افسانہ نگاروں کے افسانے بھی آچکے تھے بلکہ کچھ چھپ بھی چکے تھے ۔ افسانہ نگاری اور افسانوں کے بارے میں تنقیدی مضامین بھی حاصل کئے جا چکے تھے مگر دفعتاً حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ ہماری بہترین کوششیں اور ارادے صرف خواب بن کر رہ گئے ۔ کہانی نمبر کیوں نہیں شائع ہو سکا ؟ شعور اتنے دنوں بعد کیوں شائع ہو رہا ہے ۔ ان تمام باتوں کے وجوہ بیان کرنے سے اب کچھ حاصل نہیں ۔ اس سلسلے میں معذرت بھی نہیں کی جاسکتی ۔ ہر عذر عذر لنگ ہو گا ۔ ہر ندامت کا اظہار مزید ندامت کا باعث ہو گا ۔ ہم اپنی کوتاہیوں کے اعتراف میں کسی قسم کی حیلہ جوئی سے کام نہیں لینا چاہتے ۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ساری خطا ہماری ہے ۔ ہمیں احساس ہے اور یقین مانئے یہ احساس بہت تکلیف دہ ہے کہ ہمارے محترم قلمی معاونین کو کہانی نمبر کے نہ شائع ہونے سے بہت کوفت اور مایوسی ہوئی ہو گی ۔ ہمارے پاس متعدد خطوط ایسے آئے ہیں جن میں مضمون یا افسانے کو ''داب'' جانے کی شکایت کی گئی ہے ۔ یہ شکایت بالکل بجا ہے ۔ ہمارے معاونین کی خفگی اور غم و غصہ برحق ہے ۔ مگر ہم ان کو یقین دلانے کی کوشش کرینگے کہ ہماری نیت میں اس قسم کا کوئی فتور نہیں تھا ۔ ہم ان کی نگارشات سے شعور کے صفحات کو زینت دینا چاہتے تھے ۔ ان کی شمولیت کے بغیر شعور میں رہ کیا جاتا ہے ! مزید براں ان کے افسانوں اور مضامین کی

نوعیت اور معیار ایسا ھے کہ اشاعتی تعویق کے باوجود انکی تازگی، جاذبیت اور معنویت میں فرق نہیں آسکتا اسی طرح قارئین کی طرف سے بھی ھمیں متعدد خطوط موصول ھوئے ھیں جن میں شعور کے نہ نکلنے پر افسوس ظاھر کیا گیا ھے، غیرت دلائی گئی ھے اور جواب طلب کیا گیا ھے۔ ھم ان سے بھی اپنی تمام کوتاھیوں کا اعتراف کرتے ھیں۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود ھم اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جہاں شعور کے معاونین اور قارئین کی شکائتیں اور عتاب نامے ھمارے آئندہ کے ارادوں اور منصوبوں کے لئے ایک ضروری تنبیہ اور رہنمائی کی حیثیت رکھتے ھیں وھاں یہ ھماری تقویت کا باعث بھی ھیں ھمارے لئے یہ احساس کچھ کم تسکین دہ نہیں ھے کہ ھمارے معاونین اور قارئین ھمیں بھولے نہیں اور انھوں نے ھمیں اس قابل سمجھا کہ اپنے خطوط، تنبیہوں، مشوروں اور ھدایتوں سے سرفراز فرمایا۔ اس سے اس تعلق خاطر کا پتہ چلتا ھے جو انھیں شعور سے ھے اور ھمیں قوی امید ھے کہ ان کا تعاون شعور سے بدستور برقرار رھیگا۔

اس شمارے کے بعد سے ھم شعور کو ماھنامے میں تبدیل کر رھے ھیں۔ اسے اعلان نہ سمجھیئے گا کیونکہ اعلانات کے سلسلے میں ھم آپ دونوں کو تلخ تجربات ھو چکے ھیں۔ ھم صرف یہ عرض کرنا چاھتے ھیں کہ آیندہ سے شعور آپکو پابندی کے ساتھ ماہ بہ ماہ ملا کریگا۔ اس تبدیلی کی دو وجہ ھے۔ پہلی تو یہ کہ اس طرح ھم اپنے اوپر پابندی عاید کرنا چاھتے ھیں تاکہ سہ ماھی، ششماھی اور خاص نمبرں کے نام پر ھمیں ٹال مٹول اور دیر کرنے کا موقع نہ ملے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ھے جو ھم اپنے سر لے رھے ھیں۔ اردو ادب کی موجودہ صورت حال آپ کے پیش نظر ھے۔ پرچوں کی بہتات ھے مگر اچھے لکھنے والوں کی کمی ھے یہ عجیب و غریب تضاد ھے۔ اسی لئے شعور کے معیار کو بدستور بلند رکھنا اور ھر ماہ پابندی کے ساتھ شائع بھی کرتے رھنا جسقدر دشوار ھے وہ آپ پہ روشن ھے۔

دوسری اور سب سے اھم وجہ ادب کی یہی صورت حال جسکا ابھی ذکر کیا جاچکا ھے۔ اس صورت حال کے بارے میں

ہمارے ذمہ دار ناقدین بار بار اپنے تحریروں میں ، بالواسطہ اور بے واسطہ طور پر یہ حکم صادر فرما چکے ہیں کہ ادب جمود اور تعطل کا شکار ہو چکا ہے۔ اس میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہوچکا ہے اور کوئی جاندار تخلیق سامنے نہیں آرہی ہے دیگر اسباب سے قطع نظر اس تعطل اور جمود کا ایک سبب ہمارے رسالوں کی موجودہ روش اور انداز اشاعت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج ادب کو بنانے بگاڑنے ، مقبول اور غیر مقبول بنانے میں ہمارے رسالوں کا ہاتھ ہمارے ادیبوں اور شاعروں سے کسی طرح کم نہیں ہے ۔ نئی شخصیتوں سے ہمیں روشناس کرانے اور ان کو ابھارنے میں رسالوں نے ہمیشہ بڑی مدد دی ہے اور دے سکتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج اتنے بہت سے اچھے اور معیاری رسالوں کے باوصف یہ آواز تقریباً ہر گوشے سے سنائی دیتی ہے کہ کوئی جاندار تلغیق سامنے نہیں آرہی ہے اسی لئے ہمیں اپنے رسالوں کی طرف توجہ دینی لازمی ہے۔ آخر وہ کیا کر رہے ہیں ؟ اچھے اور نئے لکھنے والے کیوں سامنے نہیں آرہے ہیں یا نہیں لائے جا رہے ہیں ؟ کیا واقعی نئے اور اچھے لکھنے والے نہیں ہیں ؟ کوئی بھی ایسا شخص جو ادب اور زندگی دونوں کو دوست رکھتا ہے اور ان کے آپس کے رشتوں سے واقف ہے اتفاق نہیں کر سکتا کہ آج اچھے نئے لکھنے والے نہیں ہیں ۔ بات صرف اتنی ہے کہ انہیں اچھے رسالے نہیں مل رہے ہیں ۔ اور یہ ادب کی بڑی بد نصیبی ہے ۔

ہمارے ہاں آجکل دو قسم کے رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ پہلی قسم کے رسالے سال میں ایک بار یا دو بار یا تین بار شائع ہوتے ہیں اور بڑی آب و تاب سے شائع ہوتے ہیں۔ ایسے رسالوں میں بالعموم اُن لکھنے والوں کی شمولیت روا رکھی جاتی ہے جو ادب میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں یا مقبول اور مشہور ہوچکے ہیں ۔ ان رسالوں میں نئے لکھنے والوں کی رسائی مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ دوسری قسم کے رسالوں میں ماہنامے ہیں۔ ان میں بعض اب بھی حتیٰ المقدور اپنے سابقہ معیار کو برقرار رکھنے میں کوشاں ہیں ۔ مگر سہ ماہی ، شش ماہی اور سالانہ قسم کے رسالوں کی مرعوب کن فہرست مضامین جس میں صف اول کے لکھنے والوں کے

نام شامل ہوتے ہیں ۔ ہیبت آفریں اور احترام پر مجبور کر دینے والی ضخامت اور قابل صد ستائش کتابت اور طباعت کے سامنے یہ بے چارے ماہنامے ٹک نہیں پاتے۔ ہمارے دلوں میں ان ماہناموں کے لئے وہ شوق ، لپک ، جذبہ احترام اب نہیں پیدا ہو پاتا جو ہم میں پہلے ان کو دیکھتے ہی پیدا ہو جاتا تھا ۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ نئے لکھنے والوں کے حق میں یہ ماہنامے ایک ادبی قبرستان کا کام دینے لگے ہیں ۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ اگر ارسطو بھی ان میں لکھتا رہے تو لوگ اس کی طرف توجہ نہ کریں ۔ قارئین کی عدم توجہی بھی نئے ادیبوں اور شاعروں کی پذیرائی کے سلسلے میں ایک مسئلہ بن گئی ہے ۔ لیکن قارئین میں اس ذہنیت کو پیدا کرنے کی ذمہ داری بھی ان رسالوں پر ایک حد تک آتی ہے جو طویل اور صبر آزما وقفۂ انتظار کے بعد جملہ بڑے ناموں کو سمیٹ کر نکلتے ہیں ۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ایسے رسالے ہمارے ادب کے لئے مضر ہیں ۔ ان رسالوں نے محدود طریقے پر ادب کی خدمت کی ہے بڑے اچھے خاص نمبر نکالے ہیں اور بعض اچھی چیزیں ادب کو دی ہیں ۔ مزید براں انہوں نے لکھائی چھپائی کا ایک اعلیٰ معیار بھی قائم کیا ہے جو ہر لحاظ سے پیروی کے لائق ہے ۔ یہاں اس تمام بحث کا مقصد ان دو قسم کے رسالوں میں سے کسی کی مخالفت یا موافقت کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اُس صورت حال کو واضح کرنا تھا جسکی بدولت نئے لکھنے والے نظرانداز کئے جاتے رہے ہیں اور نظرانداز کئے جا رہے ہیں ۔ ماہناموں میں وہ اُبھر نہیں پائے ——— سالناموں میں ان کے لئے جگہ نہیں ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ادب کی وہ تخلیقی رو وہ تسلسل تقریباً بند ہو چلا ہے جو اُسکی بقا اور ترقی کا باعث ہوتا ہے ۔ اس تخلیقی رو اور تسلسل کو صرف ہمارے ماہنامے برقرار رکھ سکتے ہیں ۔ وہی ہمیں صحیح معنوں میں نئے نام دے سکتے ہیں ۔ مگر اس کے لئے بڑی محنت اور جرات درکار ہے ۔ یہ امر تقویت کا باعث ہے کہ ہمارے ماہنامے کم ہمت نہیں ہیں ہمیں ادب ، ادیب اور قاری پر اعتماد رکھنا چاھئے اور ماہناموں میں نیا خون دوڑانا چاھئے ۔ یہی وہ بنیادی اعتماد ہے شعور کو ماہنامے میں تبدیل کرنے کا محرک بنا ہے ۔

شعور کے آئیندہ پرچوں میں وہ تمام افسانے اور مضامین شائع ہوتے رہینگے جو اس شمارے میں رہ گئے ہیں اور جو ہمارے لئے قابل قبول ہیں اس شمارے میں ان کی عدم شمولیت کا باعث صرف یہ امر ہے کہ ہم اس کو کسی طرح جلد از جلد ترتیب دیکر ماہنامے کی طرف توجہ دینا چاہتے تھے۔ اس شمارے میں ممکن ہے بعض ایسی کہانیاں بھی ملیں جو کہیں اور شائع ہو چکی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے بعض معاونین نے کہانی نمبر کے نہ نکلنے سے اکتا کر اسے کسی دوسرے رسالے کو بھیج دیا ہو۔ ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو۔ ممکن ہے نہ ہوا ہو۔ ہم وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ اتنا ضرور ہے کہ یہ تمام کہانیاں پہلے شعور ہی کو بھیجی گئی تھیں۔

اب آخر میں ایک بات اور آئندہ سے شعور کی ادارت مجتبیٰ حسین صاحب کے سپرد کی جا رہی ہے۔



ماں اور بچہ

از زیڈ ازگر



مجتبیٰ حسین

اردو افسانہ نگاری کے رجحانات

فرض کیجئے آپ سے پوچھا جائے' کہ پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے اور اس کے کچھ بعد آپ کس قسم کے افسانوں کو پڑھنا پسند کرتے تو آپ کیا جواب دینگے ۔ اس میں شک نہیں کہ اس نوع کے سوالات کرنا بد مذاقی ہے اور شاید گستاخی بھی ۔ اسکے علاوہ یہ کوئی بہت زیادہ مناسب سوال بھی نہیں ہے ۔ اسکا لہجہ غیر شاعرانہ اور کاروباری ہے ۔ یہ ادب سے زیادہ اقتصادیات کا سوال معلوم ہوتا ہے اور سیاسی مضمرات کا بھی حامل ہوسکتا ہے ۔ لیکن یہاں اس سوال کے اٹھانے کا مقصد آپ کا امتحان لینا یا آپ کے مذاق اور تاریخ دانی کا اندازہ لگانا ہرگز نہیں ہے ۔ اس کا پوچھنا بدمذاقی تو ہو سکتا ہے مگر یہ گستاخی کی نیت سے قطعاً نہیں کیا گیا ہے اور نہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ادبی پسند اور نا پسند کے سلسلے میں آپ پر کچھ پابندیاں عائد کی جائیں اور اسطرح اردو کے افسانوی ادب کے انتخاب میں آپ کی رہنمائی کی جائے ۔ ادب کسی لائحہ عمل یا ٹائم ٹیبل کا پابند نہیں کیا جاسکتا ۔ اس بات کو یہاں دہرادینے کی ضرورت صرف اس لئے محسوس ہوئی کہ کسی قسم کی بد گمانی کی مزید گنجائش نہ رہ جائے ۔ ادب کی اپنی ایک تاریخ تو ہوتی ہے مگر خود ادب صحافت کی طرح دن اور تاریخ کا اسیر نہیں ہوتا ۔ یہ دن اور تاریخ سے متاثر ہوتا ہے مگر وقت کے آگے اور پیچھے دونوں دیکھ سکتا ہے ۔ اس کی آنکھوں میں ماضی ، حال اور مستقبل سب کا نور ہوتا ہے ۔ لہذا اس سوال کا منشاء نہ آپ کے علم و فضل

کو پرکھنا ھے اور نہ اپنے نظریات اور خیالات کو آپ پر مسلط کرنا ھے۔ یہ بات تو آپ سے پوچھی ھی اسی لئے گئی ھے کے آپ کے ذریعے اُس مضبوط رشتے کو ڈھونڈا جا سکے جو ھر دور کے ادیبوں اور ادب کے پڑھنے والوں کے درمیان ھوتا ھے۔ آپ کا جواب بڑا اھم ھوگا اور صرف اسی جواب کی روشنی میں ناقد اپنے ادبی جستجو کے جذبے کو تسکین دے سکتا ھے ۔ تنقید نگاری یوں بھی کچھ بہت زیادہ معقول مشغلہ نظر نہیں آتی ۔ ناقد کا ادیب اور قاری کے درمیان ایک ''ایجنٹ'' بن کر گھس آنا بسا اوقات ادبی فضا کو مکدر کردیتا ھے ۔ ادب کی بہت سی بد مذاقیوں کی وجہ صرف یہی رھی ھے کہ ناقد قاری میں ادبی مذاق پیدا کرنے اور اس کو ادبی تربیت دینے پر ضرورت سے زیادہ مصر رھا ھے۔ ادب کے معاملات میں ناقد کی غیر ضروری مداخلت بعض اوقات نا قابل برداشت ھو جاتی ھے۔ یہ نہ سود مند ھے اور نہ ادب کے جملہ پڑھنے والوں کی تربیت کسی ناقد کے بس کی بات ھے۔ مرزا غالب کا دیوان لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے ھاتھوں میں پہنچ چکا ھے اور پہنچتا رھیگا ۔ ان لاکھوں کروڑوں پڑھنے والوں کے درمیان ذرا غور کیجئے ناقد کی آواز نقارخانے میں طوطی کی آواز کے سوا اور کیا ھو سکتی ھے۔ تنقید نگاری کی ضرورت ، اس کے ادبی رول اور اسکی عظمت کو گھٹائے اور اُس سے انکار کئے بغیر یہ بات طے شدہ طور پر کہی جاسکتی ھے کہ ناقد قاری کی پسند اور نا پسند سے منہ موڑ کر کسی زمانے کے ادب کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ھوسکتا ۔ ناقد کا کام قاری اور ادب کی سر پرستی نہیں ۔ اُسے ان دونوں کی سر پرستی میں جینے کا فخر حاصل ھونا چاھیئے ۔ ادب اور قاری کا رشتہ براہ راست ھے ۔ ناقد زیادہ سے زیادہ اس رشتہ کو اور مضبوط کر سکتا ھے ۔ اُن دیواروں کو ھٹا سکتا ھے جو ادب اور ادب کے پڑھنے والوں کے درمیان حائل ھوجاتی ھیں مگر اُسے خود ان کے درمیان ایک دیوار بن کر حائل نہ ھونا چاھئے ۔ ''تو برائے وصل کردن آمدی'' والی بات ھمیشہ اسکے پیش نظر ھونی چاھیئے ۔ ''فضل کردن'' کی نیت نہ معلوم کتنے ناقدوں کو مضحکہ خیز بنا چکی ھے۔ اسی لئے اوپر جو سوال کیا گیا ھے اسکا مقصد محض آپ کی رائے اور پسند اور نا پسند کے ذریعے اردو افسانوں کی ان منزلوں کو تلاش کرنا ھے جن سے ھو کر اردو کی

افسانہ نگاری گزری ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ افسانے ناقد کے لئے نہیں قاری کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ اب اس کے بعد مذکورہ سوال شاید ایسا غیر ادبی نہ معلوم ہو جیسا شروع میں معلوم ہوتا ہے۔ البتہ یہ ایک حد تک غیر شاعرانہ ضرور ہے۔ ممکن ہے یہ آپ کے ادبی مذاق اور شاعرانہ حس پر گراں گزرے۔ لیکن آپ کے جذبات سے اپیل کرنے کی جگہ اگر اس سوال کے ذریعے آپ کی سوچی سمجھی رائے معلوم کی جا سکے تو اسکا مقصد پورا ہو جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ اس سوال میں ایک نوع کی کاروباری ذہنیت پائی جاتی ہے اور یہ کچھ اقتصادی اور سیاسی سوال بھی بن جاتا ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے ادب کے "فقر و استغنا" کو ٹھیس پہنچ جانے کا اندیشہ ہو۔ رسد اور طلب کے معاملے سے ادب بھی بےخبر نہیں ہے اور پڑھنے والوں کی 'طلب' اور لکھنے والوں کی 'رسد' کا مسئلہ ایک سماجی اور سیاسی مسئلہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ براہ راست 'مارکیٹ' کا نہ ہوتے ہوئے بھی ادب کی سمت متعین کرنے میں بڑی حد تک اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ ادیب صرف وہی چیز لکھے گا جسکی مانگ ہو ٹھیک نہیں ہے مگر اس سے یہ بھی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ادیب صرف وہی چیز لکھے گا جسکی مانگ نہ ہو۔ ادیب اور قاری کے باہمی رشتے کہ بارے میں اس طرح سوچنا کچھ مصنوعی سا ہوجاتا ہے۔ اس میں یہ پہلے سے طے کرلیا جاتا ہے کہ ادیب اور قاری میں ایک افتراق اور دوری ہے اور دونوں ایک بازار میں ملتے ہیں مول بھاؤ کرتے ہیں خرید و فروخت کرتے ہیں اور اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ بات بالکل اسکے بر عکس ہے۔ ادیب اور قاری ایک ہی روح کے دو مظہر ہیں وہ ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں۔ ان میں قرب ہے دوری نہیں۔ ان میں مکمل اشتراک ہوتا ہے۔ دونوں کے دلوں میں بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ اور قاری کے دل میں تو اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ ادیب کی زبان سے اپنے خلاف سخت سست باتیں سن کر بھی خوش ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ ادیب کو کبھی کبھی معاشرتی حقائق سے بے نیاز ہونے کی اجازت دے دیتا ہے۔ ادب ایک ایسا عمل ہے جس میں ادیب اور قاری دونوں برابر کے شریک ہیں۔ قاری ایک طرح کا (Sleeping Partner)

اور ادیب (Active Partner) قاری سرمائہ بہم پہنچاتا ہے، ادیب کے لئے فیضان کا باعث ہوتا ہے اور ادیب اسکی تہذیب کو فروغ دیتا ہے۔ اس میں زندگی کی برکتوں کا احساس ابھارتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے ضروری ہیں۔ معاشرے اور ادیب کا ربط باہم صرف گہراهی نہیں بلکہ کچھ جسم اور جان کا سا ہوتا ہے۔ معاشرے کا یہ تصور ادیب پر چند پابندیاں عائد کرتا ہے مگر اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے معاشرے کا اسیر ہو کر رہ جائے۔ ہر آزادی کے لئے پابندی ضروری ہے ادیب انہیں پابندیوں کے احساس کے ساتھ جو اس پر اپنے معاشرے کا سب سے بیدار فرد ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتی ہیں اپنی آزادی کو معتبر اور قابل احترام بناتا ہے۔ وہ چاہے تو ان پابندیوں سے منہ موڑ کر پورے معاشرے کو نظر انداز کر سکتا ہے مگر وہ اس معاشرے سے باہر نہیں جا سکتا۔ ”معاملہ“ اسے اپنے معاشرے کے ساتھ ہی کرنا پڑتا ہے۔ ادیب کا قاری سے بچ کر نکل جانا تقریباً محال ہے اور افسانہ نگار کو تو خاص طور پر اپنے قاری سے معاملہ کرنا پڑتا ہے۔ ایک شاعر کے لئے شاید یہ ممکن ہو کہ وہ اپنی شاعری کو اپنے ہی تک محدود رکھے مگر افسانہ نگار کے لئے نہ یہ ممکن ہے اور نہ یہ صنف افسانہ نگاری کی بنیادی تقاضے سے ہم آهنگ ہے۔ کہانی کہنے والے کے لئے کہانی سننے والے کی همیشه ضرورت پڑتی رهیگی۔ ادب کی تمام اصناف میں افسانوی ادب کا اپنے معاشرے سے تعلق اگر سب سے قریبی نہیں تو 'عملی' ضرور ہے۔ یہ اپنے دور کے سماجی تجربات اور تاثرات سے بوجھل ہوتا ہے۔ اسی لئے اردو افسانہ نگاری کے رحجانات کے تعین کے سلسلے میں اگر آپ سے کوئی سوال کر لیا جائے تو اسکا منشاٴ صرف یہی ہے کہ آپ کی رهنمائی میں هم اس سر چشمہ تک پہنچ سکیں جہاں سے افسانوی ادب کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

پہلی جنگ عظیم سے ذرا پہلے اور اسکے ذرا بعد کی شرط کوئی قطعی تاریخ مقرر کرنے کے لئے نہیں رکھی گئی ہے حالانکہ ۱۹۱۴ء صرف ہندوستان ہی نہیں دنیا کی سماجی، سیاسی اور ادبی تحریکات کے سلسلے میں بہت اهمیت رکھتا ہے۔ یہ ایک موڑ ہے جہاں سے نئے دور کا آغاز ہونے لگتا ہے۔ اگر هم اس چیز کو مدنظر

رکھیں تو مندرجہ بالا سوال کی کچھ اور بھی وضاحت ہوجاتی ہے۔ ہندوستان میں جنگ عظیم سے کچھ پہلے مذہبی، سماجی، اصلاحی اور نیم سیاسی تحریکیں شروع ہوچکی تھیں۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی ادبیات اور مغرب کی فلسفیانہ اور سیاسی تحریکات سے ہم روشناس ہورہے تھے۔ ان کے اثرات ہماری سماجی زندگی اور ادبی تخلیقات میں خوشگوار طور پر نمایاں ہورہے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر سماجی اقدار میں تبدیلی کی رفتار تیز تر ہوگئی اور سیاسی شعور پختہ تر ہوکر قومی تحریک کی صورت میں زندگی کے ہر شعبے میں سر گرم کار ہوگیا۔ اس زمانے میں ہندوستان کا تہذیبی کارواں ایک ایسے عبوری موڑ پر آگیا تھا جہاں ادبی سفر کے سلسلے میں بالکل نئے مگر دلچسپ اور دلکش لوگوں سے اسکا سابقہ تھا۔ اس موڑ پر ہمارے پیچھے عمر عیار، چہار درویش، جان عالم اور حاتم طائی کھڑے تھے اور سامنے ہیملٹ، میبکبتھ، فاوسٹ، مسٹر پک وک اور ڈان کوئی ژوٹ تھے۔ ایک طرف الف لیلا کی افسانوی راتیں تھیں تو دوسری طرف ڈانٹے کا جہنم تھا۔ مہاتما گاندھی نے مہاتما ٹالسٹائی کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ ہندوستان کی سماجی اور معاشی زندگی ہوا کے ایک تازہ جھونکے کی منتظر تھی۔ شہروں کے نو تعمیر کارخانوں کی گھڑگھڑاہٹ سے دور دراز کے دیہاتوں کی سوئی ہوئی زندگی جاگ پڑی تھی — زندگی کے اس موڑ پر آپ کس قسم کے افسانوں کو پسند کرتے؟ یہ سوال اب شاید زیادہ مضحکہ خیز نہ معلوم ہو۔ اب یہ ایک پورے دور کا سوال بن جاتا ہے۔ ہر دور اپنے قاری اور ادیب دونوں سے اسی قسم کا سوال کرتا ہے اور اس سوال کا جواب دینا ہر ادیب کے لئے لازمی اور ناگزیر ہوجاتا ہے — یہ اس دور کا چیلنج ہوتا ہے جسے قبول کرنے کے بعد ہی ادیب کی قوت اور عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سیاسی نہیں ایک ادبی سوال ہے۔ ہر ادب اپنے دور کے اسی سوال کا جواب ہوتا ہے اور جب ادب اپنا جواب دے چکتا ہے تو وہ خود ایک سوال بن جاتا ہے جسکے جواب کی تلاش میں اس کا معاشرہ آگے بڑھتا اور نئی منزلیں طے کرتا رہتا ہے۔ سوال اور جواب کے اسی تسلسل میں معاشرے کی تہذیب کا راز پنہاں ہے۔ اسی لئے جیسا کہ کہا جا چکا ہے آپ کا جواب انتہائی اہم ہوگا۔ شاید بات اب بھی توضیح طلب ہے۔ یوں

سمجھئے کہ اس موڑ پر پہنچنے کے بعد آپ اپنی پرانی کہانیوں ھی کو پڑھتے رھتے یا کچھ نئی کہانیوں کے پڑھنے کی خواھش بھی محسوس کرتے — ایسی کہانیاں جو آپ کی زندگی سے قریب تر ھوں ، جن میں نیا پن ھو ، جن میں آپ کے نئے خوابوں کی تعبیر ھو اور جن میں آپ کے سماج میں پل کر جوان ھونے والی محبت '' پریوں '' کا لفظی پردہ الٹ کر سچ مچ کی محبوبہ کو سامنے کھینچ لائے ۔ آپ کو شاید یاد ھوگا کہ آپ اس سوال کا جواب دے چکے ھیں ۔

آپ نے اس وقت جو جواب دیا تھا اُسی سے اردو کی افسانہ نگاری شروع ھوتی ھے ۔ آپ نے اس سوال کا جواب پریم چند بن کردیا تھا ۔ یہ کتنی بڑی اور کیسی عجیب بات ھے کہ آپ کا پہلا ھی جواب اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں آج بھی حرف آخر کی حیثیت رکھتا ھے ۔ اس جواب میں وقتاً فوقتاً کچھ تبدیلیاں ھوتی گئی ھیں مگر بحیثیت مجموعی اردو افسانہ نگاری کے اصل دھارے تک پہنچنے اور اس کا رخ متعین کرنے میں اس جواب سے بڑی مدد ملتی ھے ۔ یہ اردو افسانہ نگاری کی مرکزی اور سب سے نمایاں خصوصیت پر ھمیشہ اثر انداز ھوتا رھا ۔ یہ خصوصیت اسکی سماجی مسائل سے گہری وابستگی کی صورت میں سامنے آتی ھے ۔ بہر حال آپ کے اس جواب کے بعد اب بات کافی صاف ھو چلی ھے ۔ افسانہ نگاری کے مختلف رجحانات تک پہنچنے کی بات تو بعد میں آئے گی یہاں کم از کم ایک چیز بالکل طے ھوچکی ھے ۔ وہ یہ کہ آپ اب نئے قسم کے افسانوں کے طالب تھے اس لئے کہ آپ کی زندگی بدل رھی تھی اور اس بدلتی ھوئی زندگی کا ساتھ دینا پرانی کہانیوں سے ممکن نہ تھا ۔ افسانہ نگاری میں اس '' نئے پن '' کی تلاش میں مغربی ادبیات بالخصوص مغربی افسانہ نگاری نے بڑا ساتھ دیا ۔ اب آپ ایک تفسیر چاھتے تھے ۔ آپ چاھتے تھے کہ کوئی ایسی چیز ھو جو پرانی اور بار بار کی پڑھی ھوئی نہ ھو ، جو آپ کو اپنے خیالات اور مسائل کے سمجھنے میں تھوڑی بہت مدد دے سکے ، کوئی ایسی کہانی ھو جو آپ سے حاتم طائی کی زبان میں گفتگو نہ کرے بلکہ اس زبان میں بات چیت کرے جسے آپ اٹھتے بیٹھتے استعمال کرتے ھیں ۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ آپ ' کہانی ' نہیں ' افسانہ ' چاھتے تھے جو اپنے آب و رنگ میں پرانی کہانیوں سے مختلف ھو —

آپ کی یہی خواہش اردو افسانہ نگاری کو بروئے کار لائی ہے۔ یہی بنیادی اور ابتدائی خواہش تھی جس سے بعد میں افسانہ نگاری کے سوتے پھوٹتے رہے ہیں۔ "نئے پن" کی یہی تلاش خواہ وہ شروع میں کچھ مبہم ہی رہی ہو اردو کی پرانی کہانیوں اور نئی کہانیوں میں (جنہیں ممیز کرنے کے لئے افسانے کہتے ہیں) حد فاصل کھینچ دیتی ہے جسکو پہچانے بغیر اردو افسانوں کے رجحانات کا تعین مشکل ہے۔ چناچہ اس بات کو تسلیم کرلینے میں تامل نہ ہونا چاہیئے کہ اردو افسانہ نگاری فکری اور فنی دونوں لحاظ سے مغربی افسانہ نگاری کی رھین منت ہے۔ جہاں تک افسانوں کی فنی تشکیل اور تعمیر کا تعلق ہے اردو افسانہ نگاری کے سامنے صرف و محض مغربی افسانوی سانچے تھے لیکن فکری لحاظ سے متاثر ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہماری فکریکسر مغربی یا مستعار تھی۔ اردو افسانہ نگاری کا فکری حصہ عموماً اسکا اپنا ہے۔ مغربی فکر ہمارے افسانہ نگاروں کے لئے ایک مہمیز، ایک تحریک ثابت ہوئی جسکے زیر اثر ہمارے افسانہ نگار اپنے ماحول پر شعوری طور پر نظر ڈالنے لگے ورنہ اس سے پہلے وہ اپنے ماحول کے وسیع تر اور گہرے افسانوی امکانات سے اتنے با خبر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو افسانہ نگاری کے سب سے اہم محرکات ہندوستان کی نئی اور بدلتی ہوئی سماجی زندگی سے وابستہ تھے جنکی تلاش اور تحقیق کے لئے ہمیں پرانی داستانوں اور کہانیوں کی ورق گردانی کی چنداں ضرورت نہیں۔ اردو میں نئے افسانے اس واسطے آئے کہ آپ نئے افسانے چاہتے تھے۔ یہ آپ کی زندگی کے مطالبات ہی تھے جنہوں نے اردو افسانہ نگاری کے ابتدائی دور میں پریم چند جیسی شخصیت دی۔

پریم چند آپ کے اس غالب رحجانی کی سب سے بڑی نمائیندگی کرتے ہیں جو کم و بیش اردو کے ہر اچھے افسانہ نگار کے یہاں اسکے اپنے دور اور اسکے انفرادی اور سماجی نقطہ نظر کے فرق کے ساتھ پایا جاتا رہا ہے۔ پریم چند نے ۱۹۰۷ء سے افسانے لکھنے شروع کردیئے تھے۔ 'سوز و وطن' ان کے افسانوں کے پہلے مجموعے کا نام ہے۔ انگریزی سرکار پریم چند سے جلد ہی نا خوش ہو گئی اور ان کے افسانے ملک کے امن کے لئے خطرناک قرار دیئے جانے لگے۔ جب افسانوں سے کوئی حکومت خطرہ محسوس کرنے لگے تو پھر یہ

سمجھ لیجئے کہ وہ افسانے سماج کی کسی ایسی ھی خواھش کی نمائیندگی کرتے ھونگے جو حکومت کی خواھش سے براہ راست ٹکراتی ھے - پریم چند کے افسانے واقعی اسی ٹکر کو پیش کرتے ھیں جو قومی تحریک کی صورت میں بیرونی حکومت کے خلاف پائی جاتی تھی - ان کے افسانوں میں قومی تحریک منزلیں طے کرتی اور آگے بڑھتی نظر آتی ھے - ان کے افسانوں میں آدمی ' خیال ' نہیں ایک حقیقت ھے جس سے ھماری کہانیاں آنکھ چراتی رھی ھیں - پریم چند نے اگر کہیں ' خیال محض ' پیش کیا ھے تو اسے آدمی بنا کر — ان کے خیالات کی منزل ھمیشہ آدمی ھی رھا ھے — آدمی جیسا وہ ھے اور آدمی جیسا اسے وہ دیکھنا چاھتے تھے - یہ دونوں چیزیں ان کی افسانہ نگاری میں کبھی الگ الگ اور کبھی ایک ساتھ ایک دوسرے میں ملی ھوئی ، ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی ھوئی ارتقائی صورت میں ملتی ھیں - حقیقت پسندی اور عینت دونوں سے انھوں نے جسطرح نباہ کیا ھے وہ اردو افسانہ نگاری کی معراج توخیر ھے ھی دنیا کی افسانہ نگاری میں بھی اسکی مثال دو ھی تین جگھہ ملتی ھے - پریم چند افسانوں کی اصل روح تک پہنچ گئے تھے - انھوں نے اس آدمی سے کبھی منھ نہ موڑا جسکی دلیری اور بہادری پر ادب اپنے ' جنم دن ' ھی سے فدا رھا ھے - افسانوں میں ساری بات ' آدمی ' ھی کی ھے - اس ' ھزار شیوہ ' اور ' ھزار چھرہ ' آدمی کے ساتھ رات دن اٹھنا بیٹھنا - پوری ھم آھنگی کے ساتھ زندگی گزارنا بڑی مشکل بات ھے - زندگی حرام ھوجاتی ھے - مگر پریم چند نے اس آدمی کے ساتھ نباہ کیا - وہ بڑی ' تپسیا ' کے بعد اس کٹھن منزل سے گزرے ھیں - ان کے افسانے کا ایک کردار کہتا ھے - "میں نے آج سمجھ لیا ھے کہ ادبی خدمت پوری عبادت ھے" - اسی جذبۂ عبادت کی وجہ سے پریم چند کے افسانوں میں انسانی زندگی اپنے آخری تجزئیے کے بعد سراپا تقدس اور عظمت بن کر ابھرتی ھے - ان کے افسانے اپنے زمانے کی پوری سماجی زندگی کا احاطہ کئے ھوئے ھیں - مولوی ، پنڈت ، بنئیے ، ساھوکار ، پٹواری ، تھانیدار ، ڈپٹی صاحب ، طوائف ، پروفیسر ، ادیب ، سیاسی کارکن سبھی ان کے ھاں ملتے ھیں - ان سبھوں سے ان کی گھری رسم و راہ ھے - ان کے امتزاج سے انھوں نے ایک ایسا مرقع تیار کیا ھے جس نے اردو کی

افسانہ نگاری کو دنیا کی افسانہ نگاری کی اعلیٰ ترین سطح تک پہنچا دیا ہے ۔ پریم چند کے بیشتر افسانے دیہات کی کھلی فضا میں سانس لیتے ہیں ۔ دیہات ہندوستان کی شاداب زمین پر ہری ہری گھاس کی طرح پھیلے ہوئے ہیں ۔ یہاں پہنچکر انہیں کھیتوں کی " مینڈھ " پر ایک آدمی نظر آیا ۔ " ننگا بدن ، پسینے میں تر ، کچھنی کسے ہوئے سیاہ فام " ۔ اس آدمی پر وہ فریفتہ ہوگئے ۔ یہ ازلی انسان تھا ۔ یہ ان کا ملک تھا ۔ اس انسان کے لئے اردو نے بڑا ہی پیارا ، نرم ، میٹھا اور سادہ سا نام دیا ۔ " کسان " ۔ اسی کسان نے ان کے تمام افسانوں کو سینچ دیا ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے سر سبز و شاداب ہوگئے ہیں ۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات کا بیان اگرچہ اصولی طور پر اس مضمون کا موضوع نہیں ہے مگر ان کی طرف سرسری طور پر توجہ دلانے کی ضرورت اس واسطے محسوس ہوتی ہے کہ وہ ہماری افسانہ نگاری کے سب سے وقیع ، پائیدار اور غالب رجحان کا مظہر ہیں ۔ وہ ہماری سماجی زندگی کے اس موڑ پر ابھرتے ہیں جس سے گزر کر بعد میں اردو افسانہ نگاری مختلف راہوں پر چل پڑی ۔ چنانچہ ان کے افسانوں کے مختلف عناصر کو سمجھ لینے سے ہمیں اردو افسانہ نگاری کے اس سب سے جان دار رجحان کو پہچاننے میں مدد ملیگی جسکو اپنانے سے اردو کا شائد ہی کوئی اچھا افسانہ نگار بچا ہو ۔

فنی اعتبار سے پریم چند کے افسانے سیدھے سادھے ہیں ۔ ان میں کوئی پیچ یا آپچ نہیں ہے ۔ وہ مغربی افسانوں کی مستعملہ فارم کو ذہن میں رکھکر لکھے گئے ہیں ۔ بس اس سے زیادہ ان میں فنی لحاظ سے اور کوئی مغربی اثر نہیں پایا جاتا ۔ ان کے افسانے ایک سیدھی لکیر ہیں ۔ ' ٹیڑھی لکیر ' اردو میں بعد کو آئی ہے جب ہماری زندگی میں زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہونی شروع ہوئی ہیں اور جب ہم نے ان پیچیدگیوں کو زیادہ اہم اور آدمی کو کم اہم سمجھنا شروع کردیا ۔ پریم چند کو اپنے افسانوں کی تشکیل کے سلسلے میں کسی فنی نمائش یا ترکیب کا سہارا لینا نہیں پڑا ۔ ان کا فن ان کے افسانوی ادراک کا ایک جزو ہے ۔ وہ کہیں باہر سے نہیں آیا ہے ۔ وہ افسانے کی روح سے پیوست ہے اور اسی کے ساتھ بیدار ہوتا جاتا ہے ۔ پریم چند اپنے افسانوں کو غیر ضروری الٹ پھیر سے بچا کر

بڑی آسانی کے ساتھ شروع کر دیتے ھیں - اس میں تصنع یا کوشش کا دخل بہت کم پایا جاتا ھے - وہ انتہائی بے تکلفی کے ساتھ پہلے ھی جملے سے پڑھنے والے کو اپنا ھم نوا بنالیتے ھیں - انہیں دوسروں تک اپنی بات پہنچانے کے لئے کسی خاص تمہید کی ضرورت اس لئے نہیں پڑتی کہ انہیں پڑھنے والوں پر بھروسہ ھے - اُن سے ان کی گھری شناسائی ھے افسانہ نگار اور پڑھنے والوں کے بیچ میں اگر مغائرت آگئی تو پھر داستان کا لطف چلا جاتا ھے - اُن سے زیادہ اس راز سے اردو کا اور کوئی افسانہ نگار واقف نظر نہیں آتا - ان کے یہاں افسانہ گوئی کی ازلی روح ملتی ھے - صدیوں سے جسطرح کہانی کہی جاتی رھی ھے اسی طرح وہ بھی اپنے افسانے شروع کردیتے ھیں - پہلے کہانی یوں شروع ھوتی تھی کہ ایک ملک میں ایک بادشاہ تھا جسکے دو یا تین یا دس بیٹے تھے - پریم چند یوں شروع کردیتے ھیں کہ ایک گاؤں میں دو بیل تھے - فرق صرف امتداد زمانہ کا ھے ورنہ پریم چند وھی قدیمی افسانہ نگار ھے جو صدیوں سے ھمارے دل میں بیٹھا کہانی سنا رھا ھے -

ذھنیت اور فکر کے لحاظ سے پریم چند کے افسانے خالص ھندوستانی ھیں - ان کے افسانے مذھبی ، اخلاقی اور اصلاحی راھوں سے گزر کر سیاست کی منزل تک پہنچے ھیں - مگر اس پورے سفر میں قومی آزادی کی تحریک پریم چند کی رھنما بنی رھی - اُس کی قیادت کے وہ کبھی منکر نہیں ھوئے - اسی لئے ان کے افسانوں میں جو قوت پائی جاتی ھے وہ ھندوستان کے کروڑوں آدمیوں کی مجموعی قوت ھے - ھندوستان کی سماجی زندگی جس اصلاح اور انقلاب اور ان دونوں جذبوں سے پیدا ھونے والی کشمکش سے تعمیر پارھی تھی پریم چند کے افسانے اسکی نمائیندگی کرتے ھیں - ان کے افسانوں کے ذریعئے اس رجحان کو دریافت کیا جا سکتا ھے جو آگے چل کر مصلحتوں کی بنا پر سیاسی کہلایا جانے لگا حالانکہ یہ صرف ایک سماجی رجحان ھے جو اسقدر نمایاں ھے کہ اُسے پہچاننے کے لئے خصوصاً اس زمانے میں زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں - بہر حال چونکہ سماجی رجحان ایک وسیع اور غیر واضح تعریف ھے اور اسے دوسرے سماجی رجحانات سے تمیز کرنے میں دقت پیش آسکتی ھے اس لئے موجودہ زمانے کی اصطلاح میں سیاسی کہہ لیجئے - لیکن اگر اس

تعریف سے بھی کسی قسم کے ابہام کے پیدا ہونے کا امکان ہے تو اسے سرکار برطانیہ کی طرح ایک 'خطرناک، رجحان قرار دیا جاسکتا ہے۔ بہر صورت اردو افسانہ نگاری میں اس 'خطرناک، رجحان کے بانی، ترجمان اور شہ دینے والے پریم چند ہیں۔

پریم چند ہی کے زمانے میں اردو افسانوں میں ایک اور رجحان پایا جانے لگا جو مغرب کے فن برائے فن کے نظرئیے اور فلسفۂ جمالیات سے متاثر تھا۔ اردو افسانہ نگاری میں اس رجحان کو پھیلانے والوں کے گرو والٹر پیٹر اور آسکروائلڈ تھے۔ لیکن والٹر پیٹر کی ژرف نگاہی اور معلومات اور وائلڈ کی تیزی، طراری اور فطانت ان لوگوں میں نہیں تھی۔ جمالیات کے معنی ان لوگوں کے یہاں بالعموم گرد و پیش سے بے خبری اور بے نیازی ہے حالانکہ وائلڈ کے ڈرامے گرد و پیش ہی سے مرتب ہوئے ہیں۔ اردو افسانہ نگاری میں جمالیاتی تحریک کے بانیوں نے کبھی مغربی افسانوں کے براہ راست ترجموں، کبھی ان سے اخذ شدہ افسانوں اور کبھی انکے طرز پر لکھے ہوئے طبعزاد افسانوں کے ذریعے اردو کے افسانوں میں ایک نئی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے یونانیوں کے حسن 'خیال، مغرب کے فلسفۂ جمال اور مشرق کی روحانیت کو ملا کر ایک طلسمی دنیا پیدا کرنی چاہی۔ جہاں اس دنیا کے بکھیڑے نہ ہوں، جہاں من و تو کا قصہ نہ ہو، سود و زیاں کی فکر نہو۔ آنکھوں کو خیرہ کردینے والے دن کی تیز روشنی اور رات کی اندھی کردینے والی تاریکی نہو۔ جہاں پھولوں کی خوشبو ہو اور نغموں کی چاندنی۔ کوئی شور کوئی غل نہ ہو صرف دل دھڑکنے کی صدا آئے، صرف پلک جھپکنے اور آنکھوں کے اٹھنے سے زندگی بن جائے یا بگڑ جائے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس فضا میں صرف خیالات پل سکتے ہیں۔ یہاں انسان نہیں جی سکتا۔ اسی لئے اس قسم کے افسانہ نگاروں نے ہندوستان سے ذہنی طور پر ہجرت کرکے کسی "جمالستان،، میں اپنی فکر کو آباد کیا۔ اپنے مسائل اور اپنے ماحول سے بے نیازی اور جمالیاتی احساس کی طاری کردہ سرشاری ان لوگوں میں اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ انھوں نے "بے معنی،، باتوں تک کو روح کی بالیدگی سمجھ رکھا تھا۔ بے سرو پا باتیں انھیں کم از کم عام انداز فکر سے ہٹا تو دیتی

تھیں یہ تسکین ان لوگوں کے لئے بڑی چیز تھی مجنوں گورکھپوری نے ، جو بڑی حد تک اسی اسکول کے افسانہ نگار ہیں، غالباً شاعر کے انجام کے بارے میں نیاز فتحپوری کو لکھا تھا کہ میں زیدی کا حشر لکھکر اس سے زیادہ بے معنی افسانہ لکھ سکتا ہوں ۔ یہ افسانہ نگار اپنے انداز فکر اور انداز بیان میں زیادہ مغربی ہیں ۔ انھوں نے اردو دنیا کو ایک ایسی دنیا سے روشناس کرانے کی کوشش کی جو ان کے خیال میں موجود نہیں تھی حالانکہ اردو میں اسی سے ملتی جلتی ایک دنیا طلسم ہوشربا اور فسانۂ عجائب نے پہلے ہی سے آباد کرر کھی تھی ۔ پھر بھی اس جمالیاتی رجحان سے اردو افسانہ نگاری کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ افسانہ نگاروں کو نئی راہ پر سوچنے میں مدد ملی اور افسانہ نگاری میں تجربات کرنے کی امنگ پیدا ہوئی ۔ اس جمالیاتی اسکول کے بانیوں میں سر فہرست نیاز فتحپوری کا نام ہے ۔ نیاز صاحب نے کچھ افسانے ایسے بھی لکھے ہیں جو بعض سماجی اور اخلاقی مسائل سے بحث کرتے ہیں مگر ان میں سنجیدہ غور و فکر کم ہے ”چھیڑ،، کا انداز زیادہ ہے ۔ نیاز صاحب نے ان مسائل سے بحث کرتے وقت طنز نگاری سے کام لیا ہے اور اس شک نہیں ہے کہ اپنے زمانے میں انکا یہ انداز بڑا مقبول اور کامیاب تھا ۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے نیاز صاحب آج بھی اس معاملے میں اردو کے سب سے مستند طنز نگاروں میں سے ہیں مگر وہ اردو افسانہ نگاری پر اپنا کوئی گہرا نقش نہیں چھوڑ سکے ۔ نیاز صاحب کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم ل ۔ احمد اور مجنوں گورکھپوری بھی اس رجحان کے اپنے اپنے رنگ میں اہم نمایندے ہیں ۔ ان سب لوگوں کے انداز فکر اور تحریر دونوں میں ایک بلند آہنگی اور نیا پن پیدا کرنے کا جذبہ کار فرما ہے ۔ غالباً یہ اسطرح بھی روش عام سے ہٹنا چاہتے تھے ۔ ان کے یہاں بعض اوقات ٹیگور کا اثر بھی مل جاتا ہے ۔ ان افسانہ نگاروں نے انہی تمام کمزوریوں کے باوجود اپنی اپنی بساط کے مطابق اردو افسانہ نگاری کے ابتدائی دور میں مروجہ سماجی انداز سے انحراف کی قابل قدر کوشش کی ہے مگر چونکہ سماجی انداز سے انکی ”بغاوت،، کی بنیاد ”خالص،، جمالیات پر تھی ، ٹھوس سماجی حقائق سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا اس لئے اس میں کوئی جان پیدا نہ ہوسکی اور وہ بہت جلد پھیکی اور

باسی ھو کر رہ گئی ۔ خود ان کی جمالیاتی لگن کے پیچھے کوئی منظم اصولی فکر نہیں تھی اس لئے اس میں گہرائی پیدا نہ ھوسکی ۔ یہ لوگ صرف حسن پرست تھے ۔ اپنے افسانوں میں حسن اور رومان پیدا کرنا چاھتے تھے ۔ انھیں افسانہ نگاری سے زیادہ "افسانہ طرازی" عزیز تھی ۔ اسی لئے یہ رجحان زیادہ چل نہ سکا لیکن اس نے بعض ایسے شگوفے ضرور چھوڑ دیئے جنکی مہک بعد میں آنے والے بعض افسانہ نگاروں کے یہاں مل جاتی ھے ۔

اردو افسانہ نگاری ابھی جمالیاتی دھندلکے سے نکل نہیں پائی تھی کہ ایک رو اور چل پڑی ۔ یہ مزاح نگاری کی رو تھی ۔ اردو میں مزاحیہ افسانے لکھے جانے لگے ۔ مزاح نگاری کا یہ رجحان اگرچہ سماجی مسائل کو پرکھنے اور پرکھ کر پیش کرنے سے اتنا زیادہ سروکار نہیں رکھتا مگر اپنے اسلوب کے لحاظ سے ایک جداگانہ رجحان کی حیثیت ضرور رکھتا ھے ۔ یہ مزاحیہ افسانے سماجی انداز پر کسی واضح نقطۂ نظر سے تنقید یا تبصرہ کرتے نظر نہیں آتے ۔ ان کے پیش نظر بالعموم تفنن طبع ھے مگر چونکہ یہ اپنی پشت پر ایک پورے گروہ کو لئے ھوئے ھین اس لئے یہ اردو افسانہ نگاری میں ایک مزاحیہ دور کی بنیاد ڈال گئے ۔ یہ صحیح معنوں مین کسی فکری رجحان سے زیادہ فنی رجحان کی نمائندگی کرتے ھیں ۔ ان افسانہ نگاروں میں عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، ملا رموزی اور یہانتک کہ پطرس اور رشید احمد صدیقی کو بھی شامل کیا جاسکتا ھے حالانکہ مؤخر الذکر دونوں حضرات مزاحیہ افسانہ نگار سے زیادہ مزاحیہ مضمون نگار ھیں ۔ ان تمام لوگوں میں فنی اور "موضوعاتی" اعتبار سے عظیم بیگ ھی ایسے شخص ھیں جنھیں افسانہ نگار کہا جاسکتا ھے ۔ ان کے یہاں پلاٹ بھی ھے، بعض سماجی امور کی طرف توجہ بھی ملتی ھے، زندگی کے مزاحیہ پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی صلاحیت بھی پائی جاتی ھے مگر جو چیز ان کے یہاں نہیں ھے وہ 'ادبیت' ۔ ان میں وہ 'ادبیت' تقریباً مفقود ھے جو کسی بھی صنف کے لئے ضروری ھے ۔ وہ عجیب واقعات اور ان کے عجیب تر پہلوؤں کو ملا کر ایک انوکھی چیز پیدا کرنے کی کوشش تو کرتے ھیں بلکہ بے حد کوشش کرتے ھیں مگر وہ اپنے افسانوں کو سنبھال نہیں پاتے ۔ توازن اور تناسب کا

انکے ھاں سوال بہت کم اُٹھتا ھے - مزید برآں ان کی زبان (جس پر عبور حاصل کرلینا ایک مزاح نگار کے ھاں ضروری ھوجاتا ھے) ان کے 'عناں گستہ'، خیالات کا ساتھ نہیں دے پاتی اور ان کے افسانے بحثیت مجموعی آج بے جان اور پھسپھسے معلوم ھوتے ھیں۔ اس گروہ کے دوسرے افراد افسانہ نگار کم اور مزاح نگار زیادہ ھیں۔ بہر حال اس رجحان نے اردو افسانہ نگاری میں ایک کھلی ھوئی فضا، تازگی اور توانائی پیدا کی - اُسے کچھ اور بے باک بنایا جس کی وجہ سے ھمارے افسانے سماجی مسائل سے پہلے سے زیادہ کھل کر بحث کرنے لگے - ھنسنے ھنسانے کے اس رجحان نے ھمارے اعصاب کو مضبوط بنایا، ھماری سماجی تنگ نظری کو کم کیا اور ھم میں فراغت کا احساس پیدا کیا - مگر فراغت کا یہ احساس بڑا وقتی ثابت ھوا - زندگی تلخ اور زبوں ھوتی جارھی تھی، مسائل پیچیدہ ھوتے جارہے تھے، آزادی کی جد و جہد تیز ھوتی جارھی تھی - ۱۹۳۱ء میں کچھ نوجوان مصنفین نے افسانوں کی ایک چھوٹی سی کتاب ''انگارے،، کے نام سے چھاپ دی - اس کتاب نے ھمیں جھنجھلا دیا ھم ایک دم بھڑک اُٹھے - اس نے ھم سے فراغت کا احساس چھین لیا اور ھمارے دل کے چور کو شارع عام پر لا کر کھڑا کردیا اور پھر ھمیں سے کہنے لگی کہ ھم چل کر اُسے ''ملاحظہ فرمالیں،، - یہ کتاب تقاضہ کررھی تھی کہ ھم اپنے دلوں میں جھانک کر اپنی غلاظتوں اور اپنی پستیوں کو دیکھیں۔ اس کتاب میں اگرچہ تھی ھمارے دل ھی کی بات مگر ھم اسے سننے کے لئے اس اچانک طور پر تیار نہیں تھے - احتجاج کا ایک طوفان اُٹھا اور یہ کتاب ضبط کرلی گئی - اس کے لکھنے والے سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور صاحبزادہ محمود الظفر تھے - افسانوں کی یہ کتاب اگرچہ اپنے مقصد کے لحاظ سے اسی رجحان کی ایک کڑی تھی جو پریم چند کے افسانوں کے ذریعہ پیدا ھوچکا تھا مگر یہ اپنے فن اور اپنے نقطۂ نظر کے اعتبار سے یکسر نئی کوشش تھی - اس پر مغربی اثرات کی پوری چھاپ تھی - پریم چند کے اصلاحی افسانوں سے ایک قدم آگے بڑھا کر یہ انقلابی افسانوں کی طرف رھنمائی کررھی تھی - اس نے فکر اوز ھیت دونوں کے اعتبار سے مغرب کی جدید ترین تحریکات سے اردو افسانہ نگاری کو پہلی

بار روشناس کرایا - افسانوں کی اس مختصر سی کتاب کا اثر صرف اردو کی افسانہ نگاری ھی نہیں بلکہ دوسری اصناف پر بھی پڑا - یہ کتاب در اصل ایک پیغام تھی جو ھر چند بڑی عجلت، بڑے الجھے ہوے اور دل آزارانہ انداز میں دیا گیا تھا مگر تھا وقت کا پیغام - اس کے افسانوں میں بیک وقت مارکس اور فرائڈ کے نقطہ نظر کی ترجمانی تھی اور فنی لحاظ سے جوائس کا تتبع پایا جاتا تھا - ''انگارے،، کی اهمیت آج اس کے افسانوں کی وجہ سے نہیں ھے - اس کے افسانے ھنگامی ھونے کی وجہ سے پرانے اور ناقص ھوچکے ھیں - فن کے سلسلے میں بھی اب ان میں کوئی نیا پن اور دلکشی نہیں پائی جاتی - اس کے لکھنے والوں کے پیش نظر غالباً افسانہ نگاری سے زیادہ لوگوں کو مشتعل کرنا تھا - اپنے اس مقصد میں یہ کتاب کامیاب ضرور رھی مگر افسانہ نگاری کے لحاظ سے یہ آج روایت شکنی کی محض ایک تاریخ ھوکر رہ گئی ھے اس کی سب سے بڑی اهمیت یہ ھے کہ اس نے اردو میں جدید تر افسانہ نگاری کی بنیاد ڈالی - ''انگارے،، ایک منفی رجحان کو پیش کرتی ھے جس میں سماجی اقدار سے یکسر بغاوت اور انحراف کا جذبہ ملتا ھے - یہ کتاب تمام قدیمی اور مروجہ افکار اور عقائد سے نافر ھے اور سماج میں ایک نئی نگاہ پیدا کرنے کے لئے بے چین نظر آتی ھے - مگر اس کا کام صرف شکست و ریخت تک ھی محدود رھا - یہ اپنے دور سے ایک انکار عظیم ھے - اسی انکار کے سائے میں اردو افسانہ نگاری نے کینچلی بدلنی شروع کی اور نفی سے اثبات کی طرف قدم بڑھانے لگی -

''انگارے،، کے افسانے ھمارے افسانوی ادب میں پریم چند کے افسانوں کے بعد دوسرے اھم موڑ کی طرف اشارہ کرتے ھیں - در اصل اردو افسانہ نگاری کی دو سب سے مضبوط شاخیں اسی ننھے سے پودے سے پھوٹی ھیں - ''انگارے،، کے افسانوں میں ایک طرف تو سماجی اور سیاسی مسائل ملتے ھیں جو مارکس کے معاشی نظریات کی روشنی میں دیکھے گئے ھیں دوسری طرف جنس اور نفسیاتی مسائل ملتے ھیں جو فرائڈ کے نظریات سے متاثر ھیں - اردو افسانہ نگاری کا ایک سلسلہ جس سے کرشن چند اور بیدی منسلک ھیں اول الذکر نظریے سے متاثر ھے، دوسرے سلسلے میں سعادت حسن منٹو اور ایک ذرا مختلف انداز میں عصمت چغتائی کا شمار ھوسکتا ھے - ۳۰-۳۶ء

سے اردو افسانہ نگاری ان دو نمایاں رجحانات میں تقسیم نظر آتی ھے جن سے اس دور کے تمام افسانہ نگار کسی نہ کسی پہلو سے متاثر رھے ھیں۔ ان دونوں رجحانات کے درمیان کچھ ضمنی رجحانات بھی ملتے ھیں مگر وہ محض ذاتی رجحان بن کر ابھرے ھیں اور اپنا کوئی گہرا نقش نہیں چھوڑ سکے۔

"انگارے" نے فکری حیثیت سے جہاں یہ دو رجحان پیدا کئے وھاں اس نے ایک اور رجحان کو ھوا دی۔ یہ فنی رجحان تھا۔ فنی رجحان اگرچہ الگ سے بے معنی سا ھو کر رہ جاتا ھے مگر بہر صورت ھیت کے پرستاروں کے نزدیک یہ ایک مستقل رجحان کی حیثیت رکھتا ھے۔ اسی لئے فکری رجحانات سے بحث کرنے سے قبل ھمیں مختصراً اسے بھی دیکھ لینا چاھئے۔ اردو میں یہ فنی رجحان کچھ تو موضوع کے تقاضے سے ابھرا اور کچھ فکری سرمائے کی کمی کے باعث۔ پریم چند کے زمانے سے انگارے کی اشاعت تک ھمارے افسانے سیدھے سادھے انداز میں لکھے جاتے تھے۔ مگر جب سماج میں معاشی اور سیاسی الجھنیں پیدا ھونے لگیں اور ان الجھنوں نے افراد کے ذھنوں میں الجھنیں پیدا کرنی شروع کردیں تو افسانوی ھیت میں بھی تبدیلیاں ھونے لگیں۔ اس میں وھی الجھن اور اینٹھن آنے لگی جو ھمارے ذھنوں اور اعصاب میں تھی۔ ھمارے افسانوں نے زندگی کے ان 'نہاں خانوں' میں بھی پہنچنے کی کوشش کی جہاں آدمی تنہا داخل ھوتا ھے۔ جب تک افسانہ نگار اور آدمی میں رابطہ استوار رھا موضوع اور ھیت میں بھی رابطہ استوار رھا۔ دونوں ایک دوسرے کا پاس و لحاظ کرتے رھے اور افسانوں کے تشکیلی عناصر میں تقدم اور تاخر، مختلف قسم کی رد و بدل اور پلاٹ کی موجودگی یا غیر موجودگی تنظیم یا عدم تنظیم کے باوجود ھیت کوئی مجرد شے نہیں بن سکی اور ھمارے افسانے ایک "اعجوبہ" بننے سے بچے رھے۔ لیکن جب آدمی سے نگاھیں ھٹنے لگیں اور صرف اپنی طباعی دکھانے کی دھن سوار ھوئی تو افسانوں میں جوائس، لارنس اور پروست کا عطا کردہ محض "آزاد تسلسل" رہ گیا اور روح ناپید ھوگئی۔ خیریت ھوئی کہ جوائس کی اس تکنیک کو ھمارے افسانہ نگاروں نے زیادہ خراب نہیں کیا۔ یوں تو انھوں نے ھمیں بارھا یہ یقین دلانا چاھا کہ ھمارے بھی

وہ سماجی کیفیت اور ذہنیت پائی جاتی ہے جو مغرب میں ہے۔ ہمارے ہاں بھی جنسی ایذا پسندی، اعصاب زدگی، ذہنی الجھن، تنہائی کا احساس، روحانی کرب اور جنوں کا وہی عالم ہے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد مغربی معاشرے کا ایک امتیازی پہلو بن چکا تھا مگر لوگ اسے ماننے پر تیار نہیں ہوئے۔ کچھ افسانہ نگاروں نے اس مفروضے پر اپنے افسانوں کی بنیاد بھی ڈال دی۔ انھوں نے یہ تمام کیفیتیں اپنے اوپر طاری کرکے لمبے لمبے افسانے بھی لکھ ڈالے مگر لوگ اس "آزاد تسلسل" کے پھر بھی قائل نہ ہو سکے جسکے جوہر ان افسانہ نگاروں نے دکھائے تھے۔ جوائسس کے 'آزاد تسلسل' کی تکنیک اس کے سماج کی پیدا وار تھی ہمارے ہاں یہ تکنیک چند بے مایہ افسانہ نگاروں کی 'ذہنی فرصت' کی پیدا وار تھی اس لئے چل نہ سکی۔ بہر حال "انگارے" کے بعد ہماری افسانہ نگاری میں جتنے بھی فنی رجحانات پائے گئے ہیں وہ سب کے سب وہی ہیں جو اپنی ابتدائی صورت میں انگارے میں ملتے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک اور بات بھی یاد رکھنے کی ہے "انگارے" نے ہمارے افسانہ نگاروں کو مغربی افسانوں کی طرف توجہ دینے پر پہلے سے زیادہ مائل کردیا۔ اپنے افسانوی ذوق کی تربیت کے لئے اب ان کی نگاہیں باقاعدگی کے ساتھ مغربی افسانہ نگاری کا جائزہ لینے لگیں۔

فکری لحاظ سے انگارے میں جو دو رجحانات ملتے ہیں وہی بعد میں لکھے جانے والے افسانوں میں پروان چڑھے ہیں۔ ایک رجحان معاشی اور سیاسی عوامل کے ذریعے معاشرے کو سمجھنے، پرکھنے اور پیش کرنے میں کوشاں نظر آتا ہے دوسرے کے ہاں زندگی کے اس جنسی پہلو پر زیادہ زور ملتا ہے جو انسانی جبلت اور سماجی، مذہبی، اخلاقی گرفت اور فرد کی داخلی خواہشات کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے۔ پہلا رجحان آزادی کی جد و جہد اور معاشی نظریات سے قوت حاصل کرتا ہے دوسرا جدید جنسی نظریات اور انسانی زندگی کے خلاف معمول اور تاریک جنسی پہلوؤں سے بحث کرتا ہے۔ ایک اجتماعی نقطۂ نظر سے زندگی کو دیکھتا ہے دوسرا انفرادی۔ کبھی کبھی یہ دونوں رجحانات ایک دوسرے میں ملے ہوئے بھی ملتے ہیں اور ان کو الگ کرکے دیکھنا مشکل

ہوجاتا ہے پھر بھی افسانہ نگاروں کے مزاج ، انکی ادبی شخصیت اور ان کے معاشرتی ادراک کی بنا پر ان کو پہچانا جاسکتا ہے اور یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کون سا رجحان کس کے یہاں زیادہ قوی ہے ۔ کرشن چندر اور بیدی اس سلسلے کے دو سر برآوردہ افسانہ نگار ہیں جسنے معاشرے کو انفرادی خواہشات اور اعمال سے زیادہ ایک اجتماعی قانون کے تحت حرکت کرتے ہوئے دیکھا ہے ۔

پریم چند نے قومی آزادی کی تحریک کو جہاں لا کر چھوڑا تھا کرشن چندر اسے وہاں سے لے کر آگے بڑھے ہیں ۔ وہ ''آدمی،، جو پریم چند کے ہاں معاشرتی اصلاح تک، پہنچا ہے کرشن چندر کے ہاں سیاسی انقلاب کی شاہراہ پر گامزن ہے ۔ اس آدمی کی تلاش میں انھیں در بدر کی خاک چھاننی پڑی ۔ اسے انھوں نے کشمیر کی وادیوں میں تلاش کیا جہاں پھول کھلتے تھے اور رومان پلتا تھا ۔ اسے انھوں نے 'دو فرلانگ لمبی سڑک، پر ڈھونڈا پھر اس سڑک سے ہوتے ہوئے وہ بنگال کی سر زمین پر اس وقت پہنچے جب وہاں قحط پڑ رہا تھا ۔ وہاں انھوں نے اس آدمی کو بھوک سے سسکتے ہوئے اور مرتے ہوئے دیکھا ۔ اسی آدمی کو بعد میں انھوں نے اپنے حقوق کے لئے لڑتے ہوئے پایا ۔ کرشن چندر کے افسانوں میں جو اگرچہ فنی لحاظ سے کافی ناقص ہیں اسی آدمی کی وجہ سے روشنی اور حرکت ہے، زندگی اور برکت ہے ۔ ان کے افسانوں کی سب سے بڑی قوت اس تحریک سے وابستگی ہے جو ہندوستان کا مستقبل ڈھال رہی تھی یہی وجہ ہے کہ بے شمار فنی کمزوریوں کے باوجود پریم چند کے بعد وہ آج بھی اردو کے سب سے پر دم حوصلہ مند اور کشادہ دل افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں ۔

کرشن چندر کی طرح بیدی کے لئے بھی معاشرہ کا معاشی پہلو اہم ہے ۔ لیکن ان کے افسانے کرشن چندر کے سے اتنے سیاسی نہیں ہیں اور شاید منجملہ اور وجہوں کے ایک وجہ یہ بھی ہے جو ان کے افسانوں میں وہ جوش اور ابال نہیں پایا جاتا جو کرشن چندر کے افسانوں کا طرۂ امتیاز ہے ۔ بیدی ٹھنڈے دل سے سماجی محرکات کا جائزہ لیتے ہیں ، بڑی احتیاط اور جانکاهی کے ساتھ اپنے افسانوں کی ایک ایک چول بٹھاتے ہیں ۔ جلد بازی سے انھیں بیر

ہے ۔ ان کے افسانوں میں فکر اور فن دونوں کی پختگی ملتی ہے لیکن وہ چنگاری نہیں ملتی جو یکا یک ڈھیلے ڈھالے افسانوں کو بھی روشن کردیتی ہے ۔ وہ تڑپ، وہ ذھانت، وہ سمیٹ نہیں ملتی جو کرشن چندر کی فنی کمزوریوں پر غالب آکر اسے نظروں سے چھپا دیتی ہے ۔ بہر حال یہ دونوں افسانہ نگار بہت بڑے پیمانے پر اس رجحان کو پیش کرتے ھیں جو معاشرے کی کلیت کا قائل ہے اور اسے ایک ” قاش ،، کی صورت میں نہیں دیکھتا ۔

سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کی توجہ معاشرے کے جنسی پہلوؤں پر زیادہ ہے ۔ معاشرے میں چھپی ہوئی جنسی غلاظت ، کجروی اور الجھنوں کو ان دونوں افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز نظر کے مطابق پیش کیا ہے ۔ دونوں کے ھاں فن اور موضوع کو پیش کرنے میں اگرچہ اختلاف ہے مگر دونوں نے افراد کے جنسی محرکات اور میلانات سے بحث کی ہے ۔ دونوں یکساں طور پر صاف گو اور بے رحم ھیں ۔ دونوں کی طرز تحریر میں تیزی اور طراری ہے ۔ دونوں افسانے کے فنی مطالبات سے غفلت اور اجتناب نہیں برتتے ۔ اس خارجی مماثلت کے ساتھ ساتھ دونوں کے ھاں ایک مشترکہ رجحان کی داخلی مماثلت بھی پائی جاتی ہے ۔ دونوں کے ھاں آدمی کو بنانے اور بگاڑنے میں جنس کی کار فرمائی مشترکہ طور پر ملتی ہے ۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ھوتی ہے ۔ موضوع کے اعتبار سے منٹو اور عصمت چغتائی کے میں بڑا فرق ہے ۔ لیکن اس جگہ ان کے افسانوں کے موضوعات سے بحث نہیں ہے بلکہ اس رجحان کی وضاحت مد نظر ہے جو ان میں مشترک ہے ۔ موضوع اور رجحان میں ہم آهنگی بھی ھوسکتی ہے اور فرق بھی دونوں میں ایک ربط ھونے کے باوجود دونوں الگ الگ چیزیں بھی ھیں ۔ یہ صحیح ہے کہ موضوع کا انتخاب بالواسطہ طور پر افسانہ نگار کے رجحان کی بھی غمازی کرتا ہے مگر اس بات کو بھی نہ بھولنا چاھئے کہ موضوع ایک خصوصی انتخاب پر دلالت کرتا ہے اور رجحان ایک عمومی اور فکری تحریک سے بنتا ہے ۔ مثلاً تقسیم ہند کے بعد جو فسادات ھوئے وہ ھمارے اکثر افسانہ نگاروں کا موضوع بنے رھے مگر رجحانات کے لحاظ سے ان افسانہ نگاروں میں نمایاں فرق ہے ۔ بعضوں نے فسادات کے پیچھے سیاست

کے خون آلود ہاتھ دیکھے ہیں اور بعضوں نے ان فسادات کے لگائے ہوئے زخموں پر انسان کی جنسی تشنگی اور کجروی کو رینگتے ہوئے پایا ہے ۔ نقطۂ نظر کے اختلاف سے موضوع کے تجزئیے میں فرق ہوگیا اور یوں موضوع ایک ہوتے ہوئے بھی بدل گیا ۔ منٹو اور عصمت چغتائی کے سلسلے میں اسی لئے یہ دھوکا ہوسکتا ہے کہ جب دونوں کے ہاں موضوع مختلف ہیں لازماً رجحانات بھی مختلف ہونگے حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔ ان میں تمام تر اختلافات کے باوجود میلانات اور رجحانات میں کوئی بہت زیادہ فرق نہیں پایا جاتا ۔ دونوں کے ہاں اساسی اور غالب رجحان جن کی روشنی میں افراد اور معاشرے کو دیکھنا ہے ۔ اسی طرح کرشن چندر اور بیدی میں بھی فرق ہے ۔ کرشن چندر کا افسانوی مزاج رومانیت کی طرف مائل ہے اور بیدی ٹھوس حقیقت نگاری سے زیادہ سروکار رکھتے ہیں لیکن دونوں کے ہاں اشتراک کی بنیاد وہ رجحان بن جاتا ہے جو سماج کو معاشی عوامل کے آئینہ میں دیکھتا اور پرکھتا ہے ۔ اس کے برعکس منٹو اور عصمت دونوں کا عمومی رجحان معاشرے میں جنسی اثرات کی جستجو اور ان کا اظہار ہے ۔ لیکن عصمت کے ہاں اس رجحان میں رفتہ رفتہ ایک تبدیلی سی ملنے لگی ہے ان کے ہاں جنس اب معاشی اسباب کے تابع بھی نظر آجاتی ہے حالانکہ یہ تبدیلی عصمت چغتائی کے افسانوں میں کوئی نمایاں یا بڑے پیمانے پر نہیں ملتی ۔ ان کے افسانوں کا غالب رجحان آج بھی جنسی ہے ۔

منٹو کے ہاں جنس ایک جبلت، ایک اضطراری فعل، ایک اعصابی ہیجان بن کر آتی ہے اور ان سب کے امتزاج سے جو مجموعی تاثر وہ پیدا کرنے چاہتے ہیں وہ صرف اتنا ہے کہ جنسی معاملات میں آدمی سخت ناقابل اعتبار ہوتا ہے ۔ اس سے کسی وقت بھی کوئی بھی حرکت سرزد ہوسکتی ہے ۔ یہ نتیجہ افسانوی دنیا کے لئے کوئی نیا نہیں ہے ۔ ایک لحاظ سے موپاساں بہت پہلے اس کی طرف توجہ دلا چکا ہے ۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ منٹو کے ماڈل موپاساں اور سامرسٹ ماھم ہیں ۔ لیکن ان لوگوں کے برعکس منٹو نے اس نتیجے تک پہنچنے کے لئے کوئی بہت زیادہ زحمت گوارا نہیں کی ہے ۔ انھوں نے اسے دوسروں سے لے کر اپنا لیا ہے انسانی زندگی سے اخذ نہیں کیا ہے ۔ اس نتیجے کو

انھوں نے ''فکر،، نہیں ''فن،، بنایا ہے ۔ وہ اس نتیجے کو بسا اوقات صرف اس واسطے پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا افسانے کے غیر متوقع انجام پر چونک پڑے ۔ ان کے افسانوں میں معاشرے کا مطالعہ ''یکطرفہ،، اور کچھ سطحی سا ہوکر رہ جاتا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے انسان کو صرف ''جسم،، سمجھا ہے ۔ اس کی روح کو نہیں دیکھا ۔ وہ انسان کے اعصابی تقاضوں سے واقف ہیں مگر اسکے تہذیبی اور روحانی تقاضوں سے بے خبر ہیں ۔ اس جنس کو بھی وہ کوئی عظمت اور تقدس نہیں دے پائے ۔ ''گناہ،، کا جو گہرا اخلاقی احساس ہوتا ہے اس سے ان کے افسانے خالی نظر آتے ہیں ۔ منٹو آدمی کو برہنہ دیکھنے کے عادی ہیں ۔ فنکار کے لئے آدمی کو اسطرح دیکھنا کبھی کبھی ناگزیر ہوجاتا ہے مگر آدمی کو مستقل برہنہ دیکھنا شاید فنکاری کے علاوہ بیماری بھی ہے ۔ ان کے افسانوں میں کسی فکری جذبے کی غیر موجودگی کے باعث جنس ایک ''چسکا،، ہوکر رہ گئی ہے ۔ فن کے اعتبار سے شاید اردو کا کوئی بھی افسانہ نویس منٹو کا حریف نہیں ہے ۔ وہ ضروری ذہانت جو کسی فن کو ''جلا،، دیتی ہے ان میں پائی جاتی ہے مگر یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ منٹو ایسا فنکار فکری عناصر کی کمی کی وجہ سے صرف پینتروں پر اکتفا کرلیتا ہے ۔

اسی جنسی رجحان سے کچھ اور ضمنی رجحانات بھی پھوٹے ہیں جنھوں نے فرائڈ کی شعور اور لاشعور کی تاویلات کے ذریعے افسانوں کو تشکیل دیا ہے ۔ ممتاز مفتی نے لاشعور کے غیر مرئی رشتوں سے افسانوں کے تار و پود تیار کئے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے بعض افسانوں مثلاً ''آپا،، میں اس انداز کو بڑی خوش اسلوبی سے بنایا ہے ۔ لیکن اسی کے ساتھ کچھ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اگر پڑھنے والے کو یہ نہ معلوم ہو کہ ایسے افسانے فرائڈ کے لاشعور کے نظرئیے کے تحت لکھے گئے ہیں تو بھی وہ ان کی روح تک پہنچ سکتا ہے ۔ ان افسانوں میں انوکھے پن یا کسی نمایاں تکنیک کا پتہ نہیں چلتا تاوقتیکہ خاص اہتمام کے ساتھ انھیں گنجلک بنانے کی کوشش نہ کی گئی ہو ۔ ممتاز مفتی کے اس نوع کے افسانوں میں تکنیک کا کوئی نیا تجربہ نہیں ہے ۔ انھوں نے مروجہ تکنیک ہی سے کام نکالا ہے ۔ ان کے علاوہ لاشعور کی اس

اس بھول بھلیاں میں کچھ اور لوگ بھی داخل ہوئے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی اس سے باہر نہیں نکل سکا اور اردو افسانہ نگاری میں یہ لاشعور والا رجحان رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ یہ رجحان جنسی رجحان ھی کی دراصل ایک شاخ تھی جو بہت جلد مرجھا گئی۔

اردو افسانہ نگاری میں چند اور ضمنی رجحانات بھی پائے جاتے ھیں جو اگرچہ اپنی انفرادیت اور اپنے ادبی "انسپریشن" کے لحاظ سے متذکرہ بالا کسی رجحان کے تحت نہیں آتے مگر اپنی تاثر آفرینی، جمالیاتی اور رومانوی طرز تحریر اور نقطۂ نظر اور معاشرتی زندگی سے چشم پوشی کی بنا پر نتیجتاً اسی رجحان سے جا کر مل جاتے ھیں جو شروع میں نیاز فتحپوری، یلدرم اور مجنوں گھور کھپوری وغیرہ کے ذریعے اردو افسانہ نگاری میں ابھرا تھا۔ حجاب امتیاز علی، شفیق الرحمان اور قرۃ العین حیدر اگرچہ اپنی اپنی جگہ مختلف طرز تحریر اور نقطۂ نظر کے حامل ھیں اور ادبی شخصیت کے لحاظ سے بھی ان میں بڑا فرق پایا جاتا ھے (قرۃ العین حیدر یقیناً ان دونوں سے علحیدہ اور ان سے بڑی ادبی شخصیت رکھتی ھیں) مگر یہ افسانہ نگار ھمیں بالواسطہ طور پر اسی فضا میں لے جانا چاھتے ھیں جو نیاز اسکول نے اردو افسانہ نگاری کے ابتدائی دور میں پیدا کردی تھی۔ ان کی خواھشات میں ایک نوع کی یگانگت پائی جاتی ھے۔ راستے مختلف ھیں مگر منزل غالباً سب کی ایک ھے۔ شفیق الرحمان اور قرۃ العین حیدر کے افسانے اپنے اپنے رنگ میں اس رجحان کا جدید تر اظہار ھیں جو نیاز فتحپوری کے دور میں ایک دوسرے انداز سے ابھرا تھا۔ حجاب امتیاز علی کی "بوڑھی زوناش"، شفیق الرحمان کا کھلنڈرا ھیرو اور قرۃ العین کی کانونٹ کی پڑھی ھوئی مغموم اور اداس لڑکی تینوں کسی نہ کسی طرح اپنے گرد و پیش کی زندگی سے الگ ھو کر جینا چاھتے ھیں۔ حجاب امتیاز علی نے تقریباً نیاز فتحپوری کے زمانے ھی میں لکھنا شروع کردیا تھا اور اب وہ عرصے سے خاموش ھیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں کا مواد پراسرار اور ھیبتناک عناصر سے تیار کیا ھے۔ اسکے لئے انھوں نے اپنے پورے معاشرے سے منہ موڑ لیا اور:

نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ جنگل کی لی
نکل گھر سے بس راہ جنگل کی لی

افریقی کہانیوں کی ہیبتناکی کو اپناتی ہوئیں وہ لاشوں کے شہر میں پہنچ گئیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ وہاں زندگی کا گذر کہاں۔ شفیق الرحمان کے افسانوں میں ''خوش باش دمے کہ زندگانی این است،، کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں کوئی اور چیز مشکل ہی سے ملیگی۔ ایک زمانے میں انہوں نے ایک اور شگوفہ کھلا رکھا تھا۔ حاتم طائی والی زبان میں افسانہ نگاری کا سلسلہ (جو پیروڈی سے ملتا جلتا ہے) اردو میں کچھ عرصہ تک انہیں کا مرہون منت رہا۔

قرۃ العین ان دونوں سے اچھی افسانہ نگار ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ انکا نام گنانا کچھ زیادہ بر محل نہیں معلوم ہوتا۔ مگر انہیں مجبوراً اس سلسلے سے یوں وابستہ کرنا پڑا کہ وہ اسی ضمنی اور انفرادی رجحان کی ترجمان ہیں جو بہر حال اپنے رومانوی اور جمالیاتی سرچشمہ سے جاکر مل جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں سنجیدگی اور زندگی کے اعلیٰ تصور کو پیش کرنے کی کوشش پائی جاتی ہے۔ زندگی کا یہ اعلیٰ تصور انکے افسانوں میں ایک بے نام اداسی اور سعی لا حاصل سے پیدا ہونے والے احساس شکست سے مل کر ابھرتا ہے جو ان لوگوں کی روحانی زندگی میں پایا جاتا ہے جنکی وہ ترجمان ہیں۔ قرۃ العین کے ذریعے اردو میں پہلی بار کانونٹ کی لڑکی داخل ہوئی اردو افسانوں کے عام پڑھنے والوں کے لئے یہ لڑکی نئی تھی۔ یہ اپنے ساتھ رومانوں کی ایک نئی دنیا لے کر آئی تھی جس کے بارے میں ان پڑھنے والوں نے (جو بیشتر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں صرف دور ہی سے سن رکھا تھا۔ اردو افسانوں میں اس لڑکی کی آمد نے ان کے ''شکوۂ نارسائی،، کی بڑی حد تک تلافی کردی اور اب وہ اس مہذب اور بلند فکر ماحول میں ذہنی طور پر باریاب ہوسکتے تھے جو ان کے لئے ابتک صرف سنی سنائی بات تھی قرۃ العین کے افسانوں کی ایک کامیابی یہ بھی ہے کہ انہوں نے پڑھنے والوں کے ایک خاص حلقے میں ایک طرح کی (Suobish) ذہنیت پیدا کردی۔ ان کے افسانوں کی لڑکی ایک شاعرہ ہے اور اسی لئے وہ زندگی میں ناکام رہتی ہے۔ شام کے اداس سائے، پھولوں کی ہلکی ہلکی خوشبو اور تنہائی کی جراحتوں سے ملکر یہ لڑکی بنی ہے۔ ان کے افسانوں کی ساری فضا اسی لڑکی کو تعمیر کرتی ہے۔

اور یہ لڑکی جسکو سمجھنے والا کوئی نہیں ہے، جو بہت مغموم ہے ۔ صرف جذبات کے سہارے زندہ رہنا چاہتی ہے ۔ ان کے تمام افسانے اسی لڑکی کی "خود کلامی" سے بھرے ہوئے ہیں ۔ وہ محض اپنے آپ سے گفتگو کرتی ہے دوسرے کردار صرف اس لئے ہیں کہ اسکی "خود کلامی" کو سنیں ۔ اسکے دکھ کو محسوس کریں، اسکے ساتھ آنسو بہائیں، اور اسی کے ساتھ وقت کے دھندلکے میں کھو جایں ۔ خوابوں کی اس دنیا کو جسکی کوئی تعبیر نہں ہے قرۃ العین بڑی خوبی سے بساتی ہیں ۔ مگر یہ دنیا ارضی نہیں ہے ۔ یہاں ان آدمیوں کی رسائی نہیں جنھوں نے خوابوں کی اس دنیا کو تعبیر کرنے کی فراغت عطا کی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بے رنگ اور بے مہر حقیقتوں سے ٹکرا کر یہ دنیا پاش پاش ہوجاتی ہے اور ان کے افسانوں کا تاثر خشک ریت کے ذروں کی طرح بکھر جاتا ہے ۔

اردو افسانہ نگاری میں رجحانات کی تلاش اس منزل پر آکر تقریباً ختم ہوجاتی ہے ۔ ان رجحانات کی شناخت اور وضاحت کے سلسلے میں صرف وہی نام آئے ہیں جن کا ذکر کسی نہ کسی طرح ناگزیر تھا ۔ بہت سے اچھے افسانے نگاروں کا نام رہ گیا ہے اور بعض ایسے افسانہ نگاروں کے نام آگیا ہے جن کے افسانے ادبی، فنی اور افسانوی حیثیت سے زیادہ قابل اعتنا نہ تھے ۔ مگر چونکہ یہاں اردو افسانوں سے براہ راست بحث نہیں تھی صرف رجحانات کی مختلف کڑیوں کو ملانا مقصود تھا جو ہماری افسانہ نگاری میں نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں اس لئے ایسے افسانہ نگار بھی اپنی ایک مخصوص اہمیت رکھتے ہیں اور انہیں گوارا کرلینے میں کوئی زیادہ ہرج نہیں ہے ۔ ہماری افسانہ نگاری کے کمزور اور وقتی رجحانات کو آپ خود مسترد کرچکے ہیں ۔ یہاں ان کی یاد دھانی اب ایک تحقیقی ضرورت کے سوا اور کچھ نہیں رہتی ۔ بہر حال اردو افسانہ نگاری کے غالب، نمایاں اور عمومی رجحانات جنھیں ہم انفرادی اور ضمنی رجحانات سے ممیز کرسکیں وہی ہیں جنکا اوپر تذکرہ آچکا ہے ۔ مختصر طور پر ان کا خاکہ یوں پیش کیا جا سکتا ہے ۔ ابتدائی دور میں ایک طرف سماجی اصلاح پر زور اور سیاسی شعور کی نیم بیداری ملتی ہے تو دوسری طرف جمالیاتی اور رومانی راھوں پر چلنے کا شوق پایا جاتا ہے ۔ بیچ میں ایک مزاحیہ دور آجاتا ہے جو بہت جلد اپنا

کام ختم کرکے رخصت ہوجاتا ہے ۔ اس کے بعد ہندوستان کے سیاسی حالات کی تبدیلیاں اور مغربی اثرات کی رنگ آمیزی اپنے ساتھ دو اور رجحانات لاتی ہے ۔ ایک پختہ تر سماجی اور سیاسی شعور کی صورت میں ابھرتا ہے، دوسرا جنسی اور نفسیاتی تجسس کے ساتھ انسانی زندگی اور انسانی اعمال پر نظر ڈالتا ہے ۔ ان اہم رجحانات سے کچھ اور سلسلے بھی نکلے ہیں جو اپنے انداز بیان اور انداز نظر میں رومانیت، حقیقت پسندی اور انفرادیت کو جگہ دیتے رہے ہیں ۔ مگر بحیثیت مجموعی اردو کے تمام افسانہ نگار انہیں خطوط پر چند ضمنی اختلافات کے ساتھ اپنے افسانوں کو تشکیل دیتے آئے ہیں ۔

یہاں پہنچ کر ایک سوال اور ہمارے ذہن میں اٹھتا ہے — اب ہمارے جدید ترین افسانہ نگاروں کے ہاں کون سا رجحان ملتا ہے؟ اس سوال کا جواب غالباً ہمارے پاس کوئی نہیں ہے ۔ کسی عمومی رجحان کی بات تو جانے دیجئے اس لئے کہ اس میں سماجی زندگی سے گہری وابستگی شرط اول ہے، ہمارے جدید ترین افسانہ نگاروں کے یہاں کوئی خصوصی یا انفرادی رجحان بھی نہیں ملتا ۔ یہ صورت حال بہت تشویش انگیز ہے ۔ یہ بات نہیں ہے کہ ہمارے یہاں افسانہ نگاری ہی بند ہوچکی ہے ۔ افسانہ نگاری کا شغل آج بھی اسی طرح جاری ہے ۔ ۴۷ء کے بعد سے بہت سے لکھنے والے ہمارے افسانوی ادب میں آچکے ہیں اور برے بھلے افسانے برابر لکھے جارہے ہیں ۔ مگر ان افسانوں میں کوئی نئی اور متوجہ کرنے والی آواز نہیں ملتی ۔ ہمارے یہ افسانہ نگار نہ کسی سلسلۂ فکر سے وابستہ نظر آتے ہیں اور نہ وہ کوئی اجتماعی یا انفرادی سلسلۂ فکر دے سکے ۔ ان کے ہاں افسانہ لکھتے رہنے کے رجحان کے سوا اور کوئی رجحان بمشکل ہی پایا جاتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہ افسانہ نگار ایک خلا میں لکھ رہے ہیں جہاں کسی آدمی کا گذر نہیں، جہاں کسی آدمی کی آواز نہیں آتی ۔ ان کے افسانوں میں شام کے گہرے سائے بولتے ہیں، نہروں کے کنارے خزاں کے زرد زرد پتے بولتے ہیں، اداس ہوائیں بولتی ہیں، یہاں تک کہ ریل کے ڈبے بولتے ہیں مگر نہیں بولتا تو آدمی — وہ بے چارہ چپ ہے ۔ دیکھئے کب ہمارے افسانہ نگار اس مہر سکوت کو توڑتے ہیں جو انہوں نے اپنے زمانے کے آدمی کے لبوں پر لگا رکھی ہے ۔

سعادت حسن منٹو



سونورل

بشریٰ نے جب تیسری مرتبہ خواب آور دوا ' سونورل ' کی بتیس ٹکیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کی تو میں سوچنے لگا کہ آخر یہ سلسلہ کیا ہے - اگر مرنا ہی ہے تو سنکھیا موجود ہے - افیم ہے - ان سمیات کے علاوہ اور بھی زہر ہیں جو بڑی آسانی سے دستیاب ہوسکتے ہیں - ہر بار سونورل، ہی کیوں کھائی جاتی ہے -

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خواب آور دوا زیادہ مقدار میں کھائی جائے تو موت کا باعث ہوتی ہے، لیکن بشریٰ کا تین مرتبہ صرف ایسے ہی استعمال کرنا ضرور کوئی معنی رکھتا تھا - پہلے میں نے سوچا، چونکہ دو مرتبہ دوا کھانے سے اُسکی موت واقع نہیں ہوئی، اس لئے وہ احتیاطاً ایسے ہی استعمال کرتی ہے اور اُسے اپنے اقدام خود کشی سے جو اثر پیدا کرنا ہوتا ہے، موت کے ادھر اُدھر رہ کر کرلیتی ہے - لیکن میں سوچتا تھا کہ وہ ادھر کی اُدھر بھی ہوسکتی تھی - یہ کوئی سو فی صد محفوظ طریقہ نہیں تھا -

تیسری مرتبہ جب اُس نے بتیس گولیاں کھائیں تر اُس کے تیسرے شوہر کو جو پی ڈبلیو ڈی میں اوورسیئر ہیں صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب پتہ چلا کہ وہ فالج زدہ بھینس کی مانند بے حس و حرکت پلنگ پر پڑی تھی - اُسکو یہ خواب آور دوا کھائے غالباً تین چار گھنٹے ہوچکے تھے -

سب اوورسیئرصاحب سخت پریشان اور لرزاں میرے پاس آئے۔ مجھے سخت حیرت ہوئی اس لئے کہ بشریٰ سے شادی کرنے کے بعد وہ مجھے قطعاً بھول چکے تھے۔ اس سے پہلے وہ ہر روز میرے پاس آتے اور ہم دونو اکٹھے بیئر یا وسکی پیا کرتے تھے۔

اُن دنوں وہ مفلوک الحال تھے۔ سائیکل پر دفتر جاتے اور اُسی پر گھر واپس آتے۔ مگر جب اُن کی بشریٰ سے دوستی ہوئی اور وہ اُس سے شادی کرکے اُسے اپنے گھر لائے تو نقشہ ھی بدل گیا۔ اُن کا بھی اور اُن کے گھر کا بھی۔

اب وہ بہت عمدہ سوٹ پہنتے تھے۔ سواری کے لئے موٹر بھی آگئی۔ گھر بڑھیا سے بڑھیا فرنیچر سے آراستہ ھوگیا۔ ریس کھیلنے لگے۔ دیسی رم کے بجائے اب سکاچ وسکی کے دور اُن کے یہاں چلتے تھے۔ بشریٰ بھی پینے والی تھی، اس لئے دونوں بہت خوش رھتے تھے۔

سب اوورسیئر قمر صاحب کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ ھوگی۔ بشریٰ اُن سے غالباً پانچ برس بڑی تھی۔ کسی زمانے میں شاید اُسکی شکل صورت قابل قبول ھو، مگر اس عمر میں وہ بہت بھیانک تھی۔ چہرے کی جھریوں والی کھال پر بڑا شوخ میک اپ۔ بال کالے کئے ہوئے۔ بند بند ڈھیلا جیسے اوس میں پڑی ہوئی پتنگ۔ ڈھلکا ھوا پیٹ۔ انگیا کے کرینوں سے اوپر اُٹھائی ہوئی چھاتیاں۔ آنکھوں میں سرمے کی بد خط تحریر۔ میں نے جب بھی اُسکو دیکھا وہ مجھے نسوانیت کا ایک بھدا کارٹون سا دکھائی دی۔

قمر صاحب نے جیسا کہ ظاھر ھے اُس میں اس کے سوا اور کیا خوبی دیکھی ھوگی کہ وہ مالدار تھی۔ اُس کا باپ پنجاب کا ایک بہت بڑا زمیندار تھا جس سے وراثت میں اُسکو بہت سی زمینیں ملی تھیں۔ ان سے چھ سات سو روپیہ ماھوار کی مستقل آمدن ھوجاتی تھی۔ اس کے علاوہ بینک میں بھی اُس کا دس پندرہ ھزار روپیہ موجود تھا اور قمر صاحب ایک معمولی سب اوورسیئر تھے۔ بیوی تھی۔ چھ بچے تھے جن میں دو بڑے لڑکے تھے جو کالج میں تعلیم حاصل کررھے تھے۔ اُن کے گھر میں افلاس ھی افلاس تھا۔ ویسے شوقین مزاج تھے اور شاعر بھی۔ شام کو شراب بہت ضروری سمجھتے تھے، اس لئے آپ خود ھی اندازہ کرسکتے ھیں کہ اُن کے

بال بچوں کے لئے کیا بچتا ہوگا۔

قمر صاحب نے یوں تو یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ بشریٰ کو شرعی طور پر اپنے رشتۂ مناکحت میں لا چکے ہیں، لیکن مجھے شک تھا اور اب بھی ہے کہ یہ محض ایک ڈھونگ تھا۔ قمر صاحب بڑے ہوشیار اور چالاک آدمی ہیں۔ اپنی زندگی کے پچپن برسوں میں نہ جانے کتنے پاپڑ بیل چکے ہیں سرد و گرم چشیدہ ہیں۔ گرگ باراں دیدہ ہیں۔ بشریٰ سے شادی کا جھنجھٹ پالنا کیسے منظور کرسکتے تھے۔

بشریٰ سے شادی کر کے قمرصاحب کے گھر کی حالت بہت حد تک سدھر گئی تھی۔ اُن کی تین چھوٹی بچیاں جو سارا دن آوارہ پھرتی رہتی تھیں، عیسائیوں کے کسی سکول میں داخل کرادی گئی تھیں۔ اُن کی پہلی بیوی کے کپڑے بھی صاف ستھرے ہو گئے تھے۔ کھانا پینا بھی اب عمدہ تھا۔

میں خوش تھا کہ چلو ٹھیک ہے۔ دوسری شادی کی ہے، کچھ برا نہیں ہوا۔ بشریٰ کو ایک خاوند مل گیا ہے جو با سلیقہ اور ہوشیار ہے اور قمر صاحب کو ایک ایسی عورت مل گئی ہے جو بد صورت سہی مگر مالدار تو ہے۔

مگر اُن کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک مستحکم نہ رہا۔ کیونکہ ایک روز سننے میں آیا کہ اُن کے درمیان بڑے زوروں کا جھگڑا ہوا۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ دونوں نے سونورل کافی مقدار میں کھالی۔ کمرے میں فرش پر قمر صاحب بے ہوش پڑے تھے اور اُن کی اہلیہ محترمہ پلنگ پر لاش کی مانند لیٹی تھیں۔

فوراً اُن دونوں کو ہسپتال داخل کرا گیا۔ جہاں سے وہ دوسرے روز ٹھیک ٹھاک ہوکر واپس آگئے، مگر ابھی پندرہ روز بمشکل گزرے ہوں گے کہ پھر دونوں نے سونورل سے شغل فرمالیا۔ معلوم نہیں وہ ہسپتال پہونچائے گئے، یا گھر ہی میں اُن کا علاج ہوا۔ بہرحال بچ گئے۔ اس کے بعد غالباً ایک برس تک اُن کے یہاں ایسا کوئی حادثہ نہ ہوا۔ لیکن ایک روز علی الصبح مجھے پتہ چلا کہ بشریٰ نے سونورل کی بتیس ٹکیاں کھالی ہیں۔

قمر صاحب سخت پریشان اور لرزاں تھے۔ اُن کے حواس باختہ تھے۔ میں نے فوراً ہسپتال ٹیلی فون کیا اور ایمبولنس گاڑی منگوائی۔

بشریٰ کو وھاں پہنچایا گیا ۔ ھاؤس سرجن ـــ اپنے کواٹر میں تھے ۔ میں نے اُن کو وھاں سے نکالا اور سارا ماجرا سنا کر جلدی ھسپتال چلنے کے لئے کہا ۔ اُن پر میری عجلت طلب درخواست کا کوئی اثر نہ ھوا ۔ بڑے بے رحم انداز میں کہنے لگے " منٹو صاحب ـــ مرنے دیجئے اُسکو ۔ آپ کیوں گھبرا رھے ھیں " ۔

اُن کو معلوم تھا کہ بشریٰ اس سے پیشتر دو مرتبہ زھر خوری کے سلسلے میں ھسپتال آچکی ھے ـــ میں نے اُن سے بشریٰ کے بارے میں اور کچھ نہ پوچھا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس گھر چلا آیا ۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے بشریٰ کا حدود اربعہ معلوم نہیں تھا ۔ اُسکی زندگی کے سابقہ حالات میرے علم سے باھر تھے ۔ میری اُسکی متعدد مرتبہ ملاقات ھو چکی تھی ۔ وہ مجھے بھائی سعادت کہتی تھی ـ اُس کے ساتھ کئی دفعہ پینے پلانے کا اتفاق بھی ھو چکا تھا ۔

اُسکی ایک لڑکی پرویز تھی ۔ اس کی تصویر میں نے پہلی مرتبہ اُس روز دیکھی جب وہ قمر صاحب کے گھر میں بحیثیت بیوی کے آئی ۔ نیچے دو کمروں میں سامان وغیرہ سجایا جارھا تھا ۔ میں نے دیکھا کہ ایک قبول صورت جوان لڑکی کا فوٹو معمولی سے فریم میں مینٹل پیس پر پڑا ھے ۔

جب بیئر کا دور چلا تو میں نے بشریٰ پوچھا کہ یہ فوٹو کس کا ھے ۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کی لڑکی پرویز کا ھے جس نے خود کشی کر لی تھی ۔ میں نے جب اسکی وجہ دریافت کی تو مجھے قمر صاحب اور بشریٰ سے جو باتیں معلوم ھوئیں اُسکو اگر کہانی کے انداز میں بیان کیا جائے تو کچھ اس قسم کی ھوں گی ۔

پرویز ، بشریٰ کی پہلوٹھی کی لڑکی تھی جو اُس کے پہلے خاوند سے پیدا ھوئی ۔ وہ بھی کافی دولت مند زمیندار تھا ۔ یہ مر گیا ۔

مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ھوا کہ بشریٰ کا یہ پہلا شوھر جس کا نام اللہ بخش تھا اُس سے شادی کے چند برسوں بعد ھی سخت متنفر ھو گیا تھا ۔ اس لئے کہ اُسکی زندگی ھی میں بشریٰ نے کسی اور شخص سے آنکھ لڑانا شروع کردی تھی ۔ نتیجہ یہ ھوا کہ بشریٰ کو اپنے خاوند کی نفرت و حقارت سے بچنے کے لئے علحیدگی اختیار کرنا پڑی ۔ مرنے پر اللہ بخش نے بشریٰ کو ایک کوڑی نہ

دی ۔ لیکن اپنی بچی پرویز کے لئے کچھ جائیداد الگ کردی ۔

بشریٰ نے دوسری شادی کرلی ۔ چونکہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھی اس لئے پشاور کا ایک کامیاب بیرسٹر اُس کے دام میں گرفتار ہو گیا ۔ اس سے اُس کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے ۔ مگر اس دوسرے شوہر کے ساتھ بھی وہ زیادہ دیر تک جم کے نہ رہ سکی ، چنانچہ اُس سے طلاق حاصل کرلی ۔ دراصل وہ آزاد زندگی بسر کرنا چاہتی تھی ۔

یہ بیرسٹر ابھی تک زندہ ہے ۔ دونوں لڑکے جو اب جوان ھیں ، اُس کے پاس ھیں ۔ یہ اپنی ماں سے نہیں ملتے ، اس لئے اُس کا کردار انہیں پسند نہیں ۔

یہ ھے تو بشریٰ کی زندگی کا مختصر خاکہ ۔ اُسکی بیٹی پرویز کی کہانی ذرا طویل ھے ۔ اُس نے اپنا بچپن زیادہ تر دیہات کی کھلی فضاؤں میں گزارا ۔ بڑی نرم و نازک بچی تھی ۔ سارا دن سر سبز کھیتوں میں کھیلتی رھتی ۔ اُس کا ھمجولی کوئی بھی نہ تھا ۔ مزارعوں کے بچوں سے میل جول اُس کے والدین کو پسند نہیں تھا ۔ جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو اُسے لاھور کے ایک ایسے سکول کے بورڈنگ ھاؤس میں داخل کرادیا گیا جہاں بڑے بڑے امیروں کے بچے پڑھتے تھے ۔

ذھین تھی ۔ طبعیت میں جوھر تھا ۔ جب سکول سے نکل کر کالج میں داخل ھوئی تو وہ ایک خوبصورت جوان دوشیزہ میں تبدیل ھو چکی تھی جس کا مضطرب دل و دماغ ھر وقت کسی آئیڈیل کی تلاش میں رھتا تھا ۔ بہت سریلی تھی ۔ جب گاتی ، تو سننے والے اُس کی آواز سے مسحور ھوجاتے ۔ رقص بھی اُس نے سیکھا تھا ۔ ناچتی تو دیکھنے والے مبہوت ھو جاتے ۔ اُس کے اعضاء میں بلا کی لوچ تھی ۔ لوگوں کا کہنا ھے کہ جب وہ ناچتی تو اُس کے اعضاء کی خفیف سے خفیف حرکت بھی دیکھنے والوں سے ھم کلام ھوتی تھی ۔

بہت بھولی بھالی تھی ۔ اُس میں وھی سادگی اور سادہ لوحی تھی جو گاؤں کے اکثر باشندوں میں ھوتی ھے ۔ انگریزی سکول میں پڑھی تھی ۔ کالج میں تعلیم حاصل کی تھی ۔ اُس کی سہیلیوں میں بڑی تیز ، شریر اور کائیاں لڑکیاں موجود تھیں مگر وہ ان سب سے

الگ تھی ۔ وہ بادلوں سے بھی اوپر اُس فضا میں رہتی تھی جو بڑی لطیف ہوتی ہے ۔ اُسکو دھن دولت کی کوئی پروا نہیں تھی ۔ وہ ایک ایسے نوجوان کے خواب دیکھتی تھی جس کو معبود بنا کر اُسکی ساری زندگی عبادت میں گزر جائے ۔ عشق و محبت کی جائے نماز پر وہ مجسم سجدہ تھی ۔

اُسکی ماں اُسے ایبٹ آباد لے گئی تو وہاں مردوں اور عورتوں کی ملی جلی محفل منعقد ہوئی ۔ پرویز کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا رقص دکھائے ۔ اُس نے حاضرین پر نگاہ دوڑائی ۔ ایک خوش پوش پٹھان نوجوان دور کونے میں کھڑا تھا ۔ اسکی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر دمک تھی ۔ ایک لمحے کے لئے پرویز کی نظریں اُس پر رک گئیں ۔ نوجوان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس سے کچھ کہا اور پرویز جو انکار کرنے والی تھی سب کچھ بھول کر بڑے دلفریب انداز میں رقص کرنے لگی ۔

اس دوران میں اُس نے اپنے لچکیلے اور گداز جسم کے بھاؤ اور ہر رنگ سے اپنی روح کے اندر چھپی ہوئی خواہشوں کو ایک ایک کر کے باہر نکالا اور اُس پٹھان نوجوان کی متحیر اور مسحور آنکھوں کے سامنے ترتیب وار سجا دیا ۔

اس نوجوان کا نام یوسف غلزئی تھا ۔ اچھے دولت مند قبیلے کا ہونہار فرد ۔ فارغ التحصیل ہوکر اب بڑھ چڑھ کے ملکی سیاسیات میں حصہ لے رہاتھا ۔ عورت اُس کے لئے کوئی عجوبہ نہیں تھی ، لیکن پرویز نے اُسے موہ لیا ۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دونو کی شادی بڑے دھوم دھڑکے سے ہوئی اور وہ میاں بیوی بن کر ایبٹ آباد میں رہنے لگے ۔ پرویز بہت خوش تھی ۔ اسقدر خوش کہ اُس کا جی چاھتاتھا ہروقت رقصاں رہے ۔ ہروقت اُسکے ہونٹوں سے سہانے اور سماعت نواز گیت چشموں کی طرح پھوٹتے رہیں ۔

وہ یوسف تھا تو پرویز اُس کی زلیخا تھی ۔ اُسکی عبادت میں دن رات مصروف رہتی ۔ اُس نے اپنی طرف سے اُسکے قدموں میں اپنی تمام نسائیت کا جوہر نکال کر ڈال دیا تھا ۔ اس سے زیادہ کوئی عورت کیا کرسکتی ہے ۔

شروع شروع میں وہ بہت خوش رہی ۔ اتنی خوش اور مسرور کہ اُسے یہ محسوس تک نہ ہوا کہ اُس کو ازدواجی زندگی بسر

کرتے ہوئے پورے تین برس گذر چکے ہیں۔ اسکے ایک بچی ہوئی تھی مگر وہ اپنے یوسف کی محبت میں اسقدر مستغرق تھی کہ وہ کبھی کبھی اس کے وجود سے بالکل غافل ہوجاتی تھی۔

عجیب بات ہے کہ جب یہ لڑکی پیدا ہوئی تو اسنے یہ محسوس کیا کہ اس کے پیٹ سے بچی کے بجائے یوسف نکلا ہے۔ اسکی محبت نے اس کو جنم دیا ہے۔ اس سے آپ پرویز کی والہانہ محبت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

لیکن اس کے معبود کے قدم ثابت نہ رہے۔ وہ طبعاً عیش پرست تھا۔ وہ مصری کی مکھی نہیں، شہد کی مکھی کی طرح باغ کی ہر کلی کا رس چوسنا چاھتا تھا۔ چنانچہ کروٹ بدل کر اور پرویز کی محبت کی زنجیریں توڑنے کے بعد وہ پھر اپنے پہلے اشغال میں مصروف ہوگیا۔

اس کے پاس دولت تھی۔ جوانی تھی۔ پر کشش شخصیت کا مالک تھا۔ ملکی سیاسیات میں سرگرم حصہ لینے کے باعث اس کا نام دن بدن روشن ہورھا تھا۔ اسکو پرویز کی والہانہ محبت یکسر جہالت پر مبنی دکھائی دی۔ وہ اس سے اکتا گیا۔ ہروقت کی چوما چاٹی۔ منٹ منٹ کی بھینچا بھانچی، اسکو سخت کھلنے لگی۔ وہ نہیں چاھتا تھا کہ پرویز اسے مکھی کے مانند اپنی محبت کے جالے میں قید کردے جہاں وہ مرونڈا ہوجائے۔ اس کے بعد وہ اسے سفوف میں تبدیل کر کے نسوار کے طور پر استعمال کرنا شروع کردے۔

پرویز کو جب معلوم ہوا کہ یوسف سالم کا سالم اس کا نہیں تو اسے سخت صدمہ ہوا۔ کئی دنوں تک وہ اس کے باعث گم سم اور نڈھال رہی۔ اسکو یوں محسوس ہوا کہ اس کے آئیڈیئل کو ہتوڑوں کی ظالم ضربوں نے چکنا چور کر کے ڈھیر کردیا ہے۔

اس نے یوسف سے کچھ نہ کہا۔ اس کی بے اعتنائیوں اور بے وفائیوں کا کوئی گلہ نہ کیا۔ وہ کوئی حتمی فیصلہ کرنا چاھتی تھی۔ طویل عرصے تک تنہائیوں میں رہ کر اس نے حالات پر غور کیا۔ یوسف سے چھٹکارا حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا، لیکن وہ اسکی جدائی برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اس کو معبود کا رتبہ عطا کرنے والی وہ خود تھی۔ خدا کو اس کا بندہ کیسے رد کرسکتا ہے جب کہ وہ ایک بار صدق دل سے اسکی خدائی تسلیم

کرچکا ہے۔ اُس کے حضور ہروقت سجدہ ریز رہا ہے۔

اُس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ یوسف کے لئے نہیں، صرف اپنے اُس جذبے کی خاطر جس نے یوسف کو خدائی کا رتبہ بخشا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس کے ساتھ رہے گی۔ وہ اس کے لئے بڑی سے بڑی قیمت دینے کے لئے بھی تیار تھی۔

کہا جاتا ہے کہ اُس بے چاری نے یوسف کی آغوش کے لئے ہر اُس عورت کے لئے آسانیاں پیدا کیں جو اُس میں تھوڑی دیر کے لئے حرارت محسوس کرنا چاہتی تھی۔ یہ بڑی بے غیرتی تھی، مگر اُس نے اپنے ٹوٹے پھوٹے آئیڈیئل کو مکمل شکست و ریخت سے بچانے کی خاطر فرار کا یہ عجیب و غریب راستہ اختیار کیا اور ہر قسم کی بے غیرتی برداشت کی۔

وہ اُسکی چند روزہ محبوباؤں سے بڑے پیار محبت سے پیش آتی۔ اُن کی خاطر تواضع کرتی اُن کی عصمت باختہ تلون مزاجیوں کو سر آنکھوں پر رکھتی اور اُنکو اور اپنے خاوند کو ایسے موقع بہم پہونچاتی کہ اُسکی موجودگی اُن کے عیش و عشرت میں مخل نہ ہو پاتی۔

ان عورتوں کے لئے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر وہ قسم قسم کے کھانے تیار کرتی۔ اُس کا خاوند ان واہیات عورتوں کو خوش رکھنے کے لئے جب اُسے حکم دیتا کہ ناچے اور گائے تو وہ ضبط سے کام لے کر کسی بھی لمحے برس پڑنے والی مصنوعی آنکھیں خشک دکھاتی، زخمی دل پر پھاہے لگاتی، غم و غصے سے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹیں پیدا کرتی، مسرت و انبساط سے بھرے ہوئے گیت گاتی اور بڑے طربناک انداز میں رقص کرتی۔ اس کے بعد وہ تنہائی میں اسقدر روتی، اسقدر آہیں بھرتی، کہ اُسے محسوس ہوتا کہ وہ اب نہیں جئے گی۔ مگر ایسے طوفانوں کے بعد اُس میں ایک نئی قوت برداشت پیدا ہو جاتی تھی اور وہ یوسف کی دلالی میں اپنا منہ کالا کرنا شروع کردیتی تھی اور خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتی تھی کہ یہ کالک نہیں، بڑاھی خوش رنگ غازہ ہے۔

اس دوران میں اُسکی ماں اُس سے ملنے کے لئے کئی مرتبہ آچکی تھی، مگر اُس نے اپنے خاوند کے متعلق اُس سے کبھی شکایت

نہیں کی تھی - وہ اپنے راز یا دکھ میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتی تھی - ان حالات میں بھی وہ اپنے خاوند کی ذات کے ساتھ کسی اور کو کسی طریقے سے بھی وابستہ دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی - وہ یہ سوچتی کہ خاوند میرا ھے، وہ دکھ بھی میرا ھے جو وہ مجھے پہونچا رہا ھے - وہ اگر دوسری عورتوں کو بھی اسی قسم کا دکھ پہونچائے تو مجھے حسد ھوگا - لیکن وہ ایسا نہیں کرتا اس لئے میں خوش ھوں -

بشریٰ اُن دنوں فارغ تھی، یعنی اُس نے کوئی نیا شوھر نہیں کیا ھوا تھا - اُس کا وقت سیروتفریح میں گذر رھا تھا - دس پندرہ دن ایبٹ آباد میں پرویز کے ساتھ رھتی - یوسف کے ساتھ ادھر اُدھر گھومتی پھرتی - دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے - جب بشریٰ آتی تو یوسف کا دوسری عورتوں سے ملاقات کا سلسلہ منقطع ھوجاتا - گھنٹوں علحیدہ کمرے میں بیٹھے تاش کھیلنے میں اور پرویز اُن کی خاطر تواضع میں مصروف رھتی - وہ چاھتی تھی کہ اُسکی ماں زیادہ دیرتک اُس کے پاس ٹھہرے تاکہ سوسائٹی کی اُن عورتوں کا جو چکلے کی رنڈیوں سے بھی بدتر ھیں اُس گھر میں داخلہ بند رھے - مگر وہ ایک جگہ بہت عرصے تک ٹک کر نہیں رہ سکتی تھی - جب وہ چلی جاتی تو دوسرے تیسرے روز یوسف پھر اپنی پرانی ڈگر اختیار کرلیتا پرویز دوسرا روپ دھار لیتی اور اپنے خاوند کی نت نئی سہیلیوں کے قدموں کے لئے پا انداز بن جاتی -

اُس نے اس زندگی کو آھستہ آھستہ اپنا لیا - اب اُسے زیادہ کوفت نہیں ھوتی تھی - اُس نے خود کو سمجھا بجھا کر راضی کرلیا تھا کہ اُس کو زندگی کے ڈرامے میں یہی رول ادا کرنا تھا جو وہ کر رھی ھے - چنانچہ اس سے اُس کے دل دماغ سے وہ کدورت جو پہلے پہل بہت اذیت دہ تھی قریب قریب ڈھل گئی تھی - وہ خوش رھتی تھی اور اپنی ننھی بچی کی طرف زیادہ توجہ دینے لگی تھی -

ایک دن اُسے کسی ضروری کام سے اچانک لاھور جانا پڑا - دو دن کے بعد لوٹی تو شام کا وقت تھا - یوسف کا کمرہ بند تھا، مگر اُس میں سے اُسکے مخمور قہقہوں کی آواز سنائی دے رھی تھی -

پرویز نے دروازے کی ایک درز سے اندر جھانک کر دیکھا اور سرتا پا لرز گئی ۔ اُس کا پیازی رنگ ایک دم کاغذ کے مانند بےجان سفیدی اختیار کر گیا ۔

یہ سارے واقعات مجھے بڑے معتبرذرائع سے معلوم ہوئے۔ بشریٰ نے مجھے جو کچھ بتایا ، اس سے مختلف تھا ۔ اُس کا بیان ہے کہ دل ھی دل میں کڑھ کڑھ کر وہ اپنی جان سے بیزار آگئی تھی ۔ اُس نے یوسف کی خاطر بڑی سے بڑی ذلت قبول کرنا گوارا تو کرلیا تھا ، مگر اس کی بھی ایک حد ھوتی ھے ۔ ایک رات اُس نے شراب کے نشے میں بد مست اپنی کسی چہیتی کو آغوش میں لئے پرویز سے کہا کہ ناچے اور ننگی ناچے ۔ وہ اُسکے کسی حکم کو نہیں ٹالتی تھی ۔ یوسف اُس کا خدا تھا ، چنانچہ اُس نے اُس کے حکم کی تعمیل کی ۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اُس کا عریاں بدن رقصاں تھا ۔ ناچ ختم ھوا تو اُس نے خاموشی سے کپڑے پہنے اور باھر نکل کر زھر کھا لیا اور مر گئی ۔

معلوم نہیں حقیقت کیا تھی ، لیکن جو کچھ معتبر ذرائع سے معلوم ھوا یہ ھے کہ جب پرویز نے یوسف کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو اُس نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ زندہ نہیں رھے گی ، چنانچہ اُسی وقت وہ موٹر میں سیدھی ایک کیمسٹ کی دکان پر گئی اوراُس سے ' سونورل' کی پوری ڈبیا طلب کی ۔ قیمت ادا کرنے لگی تو اُسے معلوم ھوا کہ افراتفری کے عالم میں وہ اپنا پرس وھیں گھر پر بھول آئی ھے ، چنانچہ اُس نے کیمسٹ سے کہا میں مسز یوسف غلزئی ھوں ۔ پرس ساتھ نہیں لائی ۔ بل بھجوا دیجئےگا ۔ یوسف صاحب ادا کر دیں گے ۔

گھر آ کے اُس نے خادمہ کو ڈبیہ کی ساری گولیاں دیں اور اُس سے کہا اچھی طرح پیس کے لاؤ ۔ یہ سفوف اُس نے گرم گرم دودھ میں ڈالا اور پی گئی ۔

تھوڑی دیر بعد نوکر آیا اور اُس نے پرویز سے کہا کہ آپکی والدہ آئی ھیں ۔ یوسف صاحب آپکو بلاتے ھیں ۔ پرویز کی آنکھیں بالکل خشک تھیں مگر اُن میں غنودگی تھی ، اس لئے کہ زھر کا اثر شروع ھوگیا تھا ۔ منہ دھوکر اور بال سنوار کر وہ اندر گئی ۔ اپنی ماں سے بغل گیر ھوئی اور یوسف کے ساتھ قالین پر بیٹھ گئی ۔

ماں سے باتیں کرتے کرتے ایک دم پرویز کو چکر آیا اور بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گئی ۔ ماں نے تشویش کا اظہار کیا اس لئے کہ اُسکی بچی کا رنگ نیلا ہو رہا تھا ، مگر یوسف نے جو نشے میں چور تھا کسی قسم کے تردد کا اظہار نہ کیا اور بشریٰ سے کہا ”کچھ بھی نہیں ہوا اسے — بن رہی ہے“

پھر اُس نے بڑے زور سے پرویز کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا اور حاکمانہ انداز میں کہا ”اٹھ ۔ مجھے یہ ایکٹنگ پسند نہیں“ ۔

بشریٰ نے بھی اُسکو آوازیں دیں ۔ اُسکو ہلایا جلایا ۔ آخر ڈاکٹر بلایا گیا ، مگر وہ جب آیا تو پرویز اللہ کو پیاری ہو چکی تھی ۔

پرویز کی خود کشی کے متعلق کئی قصے مشہور ہیں لیکن اس کا جو پہلو مجھ پر معتبر ذرائع سے منکشف ہوا میری سمجھ میں آجاتا تھا ۔ اس لئے میں خاموش رہا اور انتظار کرتا رہا کہ اسکی تصدیق کب ہوتی ہے ۔

قمر صاحب ، بشریٰ کو ہسپتال سے واپس لائے تو میں اُن سے ملا ۔ اُن کے پاس اب موٹر نہیں تھی ۔ میں نے اس بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے شاعرانہ بے اعتنائی اختیار کرتے ہوئے جواب دیا ”جس کی تھی لے گئی“ میں نے پوچھا ”کیا مطلب ؟“

جواب ملا ”مطلب یہ کہ موٹر میری کب تھی ۔ وہ تو اُن محترمہ کی تھی ۔ میں نے کچھ عرصے سے اُس کا استعمال ترک کردیا تھا ۔ اپنی سائیکل پر دفتر جاتا اور اُسی پر واپس آتا تھا ۔ جب اُنکو ضرورت ہوتی تو میں ڈرائیور کے فرائض ادا کر دیتا تھا“

میں کچھ کچھ سمجھ گیا ”کیا ناچاقی ہو گئی !“

”ہاں کچھ ایسا ہی سمجھئے — میں نے اُنکو طلاق دیدی ہے“

بعد میں مجھے جب قمر صاحب سے مفصل گفتگو کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ نکاح وکاح کوئی نہیں ہوا تھا ۔ طلاق نامہ انہوں نے صرف اس لئے لکھا کہ لوگوں میں اس بات کی تشہیر نہ ہو کہ وہ غیر شرعی طور پر اُن کے ساتھ قریب قریب دو برس رہیں ۔

میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا ۔ اُن کے درمیان جو فیصلہ کن لڑائی جھگڑا ہوا اُسکی وجہ یہ تھی کہ بقول قمر صاحب ، اُنکی محترمہ نے حیدرآباد کے ایک ادھیڑ عمر کے مہاجر رئیس سے جسمانی رشتہ قائم کر لیا تھا ۔ اس لئے اُن کے لئے قمر صاحب کی

ذات میں وہ کشش ختم ہو گئی تھی جو کسی زمانے میں انکو نظر آئی تھی، بلکہ یوں کہیئے کہ جس کو دیکھ کر آنکی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

مجھے افسوس ہوا۔ اس لئے کہ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ قمر صاحب نے اپنی تینوں ہونہار بچیوں کو سکول سے اٹھا لیا ہے۔ خود گولڈ فلیک کے بدلے بگلے کے سستے سگریٹ پیتے ہیں۔ پہلے تفریح کے اتنے سامان مہیا تھے، پر اب شتر بے مہار کی طرح بے مطلب ادھر آدھر چکر لگاتے رہتے ہیں۔

محترمہ بشریٰ کے متعلق انہوں نے مجھے بہت کچھ بتایا لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ جب علحیدگی کا فیصلہ ہو چکا تھا اور حیدرآباد کے مہاجر رئیس صاحب نے بشریٰ کے ساتھ باقاعدہ راتیں گزارنا شروع کر رکھی تھیں تو آن کو 'سونورل' کی بتیس گولیاں کھا کر خود کشی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ بظاہر یہ خطرناک فعل قمر صاحب کے اُس اعتراض کا رد عمل معلوم ہوتا ہے جو آن کو بشریٰ کے چال چلن پر تھا، لیکن ایمان کی بات ہے کہ مجھے اس کے عقب میں ایسا کوئی دل شکن عنصر نظر نہیں آتا جو انسان کو موت کی گود میں سو جانے پر مجبور کردے۔ اس پر قمر صاحب بھی کوئی روشنی ڈالنے سے معذور ہیں۔

ایک دن باتوں باتوں میں آن سے میں آخر پوچھ ہی بیٹھا "سونورل" کھانے کی روایت جو بشریٰ کی بیٹی پرویز نے قائم کی۔ آپ نے اور بشریٰ نے جاری رکھی۔ لیکن آپ یہ بتائیے کہ وہ کونسی وجہ تھی جس نے اُس غریب کو اتنے خطرناک اقدام کے لئے تیار کر دیا۔ آپ کئی بار مجھے بتا چکے ہیں کہ پرویز اپنے شوہر یوسف غلزئی کی حرام کاریوں کی عادی ہو چکی تھی بلکہ وہ خود آسکی معاونت کرتی تھی۔ کوئی عورت جب اس حد تک پہونچ کر کشتہ بن جائے خرابے کی انتہا کو پہونچ کر تعمیر کی نہایت ہی خوفناک صورت اختیار کر لے، خود کشی کو وہ زبوں ترین فعل سمجھے، اُس کو کبھی اس کا خیال تک بھی نہیں آسکتا۔ میرا اپنا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ اُس کی ماں بشریٰ نے جسے آپ محترمہ کہتے ہیں یوسف سے ایسے تعلقات پیدا کر لئے تھے جنہیں عام لوگ ناجائز کہتے ہیں۔"

قمر صاحب نے صرف ان الفاظ میں میری تصدیق کی " یہ بالکل درست ہے — ایک دن شراب کے نشے میں بشریٰ نے اس کا اقرار کیا تھا اور بہت روئی تھی ۔ "

اسی دن شام کو معلوم ہوا کہ حیدرآباد کے مہاجر رئیس صاحب نے ' سونورل ' کی چوبیس گولیاں کھالی ہیں ۔ بشریٰ نے حسب معمول بتیس کھائی تھیں ۔ دونوں ہسپتال میں بے ہوش پڑے تھے ۔ دوسرے روز رئیس صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ چوبیس ہی میں ان کا کام تمام ہوگیا مگر بشریٰ بچ گئی ۔

آج کل وہ مرحوم کا سوگ منا رہی ہے ۔ جس شخص کے پاس اس نے موٹر بیچی تھی وہ دن رات اس کے پاس دل جوئی کے لئے موجود رہتا ہے ۔


گرم ممالک کیلئے
خصوصی ٹوتھ پیسٹ
جس میں ایسے اجزا شامل کئے گئے ہیں جو مسوڑھوں کی
بیماریوں کو دور کرتی ہے نیز گرم و مرطوب آب و ہوا کے باعث
پیدا ہونیوالے تمام امراض سے منہ کو محفوظ
رکھتی ہے
Dentogene
IODINE TOOTH PASTE
IODINE
TOOTH PASTE
Dentogene
IODINE TOOTH PASTE
IODINE
TOOTH PASTE
بہتر ٹوتھ پیسٹ
خوشنما پیکنگ
-13-59
Spotlit

بے داغ فولاد



کرشن چندر

دادر سے وہ ڈی بس میں سوار ہوا اور اوپر کی منزل پر جہاں میں بیٹھا تھا۔ ہانپتا ہوا آکر سیدھا میرے ساتھ کی خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے آنے سے پہلے برابر کی سیٹ پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ جس نے کولابے کا ٹکٹ لیا تھا۔ اور جو ایمان کی بات ہے اس قدر حسین تھی کہ اسے دیکھکر قاعدے سے مجھے کولابے کا ٹکٹ لے لینا چاہئے تھا۔ مگر اس زندگی کی چلتی ہوئی بس کو کیا کہئے۔ جس میں یوں تو ہر مسافر ساتھی ہے۔ محبوب ہے۔ بھائی ہے۔ بہن ہے۔ خاوند ہے۔ بیوی ہے۔ ماں ہے۔ باپ ہے۔ بیٹا ہے۔ پھوپھا اور چچا ہے۔ دوست اور غم گسار ہے۔ لیکن جہاں ہر شخص کی منزل الگ الگ ہے۔ جہاں ہر شخص باری باری سے بس کے اندر آتا ہے۔ باری سے اپنا ٹکٹ کٹاتا ہے۔ دو جھٹکے اور بس آگے چلدی اور کوئی نہیں پوچھتا۔ تم کون تھے کہاں سے آئے تھے۔ کدھر کو گئے۔ کیا اتنا ہی تمہارا ہمارا ساتھ تھا۔ کیا تمہارے بالوں کی اتنی ہی خوش بو، تمہاری نگاہوں کی اتنی ہی گرمی، تمہارے تبسم کی اتنی ہی ملائمت ہماری تھی۔ دو جھٹکے اور سانس غائب! اس لئے میں نے گرانٹ روڈ کا ٹکٹ لیا تھا۔ بس کنڈیکٹر نے جھک کر بڑی خندہ پیشانی سے اسے ٹکٹ دیا تھا۔ لیکن میری طرف مڑتے ہی اس کی مسکراہٹ کائی کی طرح پھٹ گئی تھی۔ ”کہاں کا ٹکٹ؟“ اس نے روز مرہ کے تجارتی لہجے میں پوچھا۔

”گرانٹ روڈ کا“

" نکالو تین آنے "

" لو تین آنے "

کھٹاک سے ٹکٹ حاضر ۔ قصہ ختم ۔ بس کنڈیکٹر آگے چلا گیا ۔ اُس کی پیشانی پر اب وہ نور نہ تھا ۔ جو ایک خوبصورت عورت کو دیکھنے سے پیدا ہوا تھا ۔ خوبصورتی کا احساس تو جانوروں میں بھی ہوتا ہے ۔ اور بس کنڈیکٹر ہر چند کہ مشین کی طرح کام کرنے پر مجبور ہے ۔ آخر ایک انسان ہے کبھی نہ کبھی اُس کے چہرے پر بھی وہ نگاہ کھل اُٹھتی ہے ۔ جو پھول کی طرح محبت کی خوش‌بو سے مہکتی ہے ۔ بس کنڈیکٹر نے اچھا ہی کیا جو وہ نگاہ اُس نے مجھ پر ضائع نہ کی ۔ حالانکہ مجھ سے پہلے اُس کی نگاہوں کا شرمیلا لہجہ بڑے مہذب طریقے سے بیان کر رہا تھا " اے خوبصورت لڑکی ۔ افسوس کہ بس صرف کولابے تک جاتی ہے ۔ اگر کہیں آگے تک جاتی اور وہاں تک جاتی ۔ جہاں تیرا گھر ہے ۔ تو وہیں کا ٹکٹ میں کاٹ دیتا ۔ اُس بس کنڈیکٹر کی ادا کو دیکھکر مجھے زندگی کے سب سے بڑے بس کنڈیکٹر کا خیال آیا ۔ جو باری باری ہر مسافر کو اُس کی منزل پر اُتار دیتا ہے ۔ اور پھر میں نے سوچا ۔ موت ضرور ایک عورت ہے ۔ موت اگر ایک مرد ہوتی ۔ تو کبھی کسی خوبصورت عورت کی جان نہ لیتی صرف ایک عورت ہی رشک و حسد کے جذبات سے مغلوب ہو کر ایسا کر سکتی ہے ۔

اب یہ تو معلوم نہیں کہ موت مرد ہے یا عورت ۔ بہر حال وہ آدمی جو دادر پر میرے ساتھ آکر بیٹھا وہ یقیناً مرد تھا ۔ اور اُسکے بیٹھتے ہی اُس کے بھاری بھر کم جسم کی اوٹ میں وہ لڑکی آگئی اور میں اُس کے بعد اُسے دیکھ نہ سکا ۔ ہاں اگر میری گردن بہت لمبی ہوتی ۔ اور اتنی خمدار ہوتی کہ آگے پیچھے با آسانی گھوم سکتی ۔ تو میں اُسے ضرور دیکھ سکتا تھا ۔ ایسے موقعوں پہ میرا جی چاھتا ہے ۔ کہ میں انسان نہ ہوتا ۔ سارس ہوتا ۔ کلنگ ہوتا ۔ زراف ہوتا ۔ شترمرغ ہوتا ۔ اگر ہوتا تو کیا ہوتا ؟

مگر اُس بھاری بھر کم آدمی نے مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا ۔ چند لمحوں کے لئے اُس نے بس میں ادھر سے آدھر نگاہ ڈالی ۔ اور پھر میری طرف اس طرح دیکھا ۔ جیسے کوئی آدمی تیسری

منزل سے نیچے کسی کیڑے کو دیکھے - میں نے چونک کر اپنی کمزور اور منحنی سی گردن کے گرد پھٹے ہوئے کالر اور بوسید ٹائی کو ٹھیک کیا - دراصل میں اس قسم کی نگاہ سے بہت بدکتا ہوں۔ میں گرانٹ روڈ کے ایک پرائیویٹ سکول میں ٹیچر ہوں - تاریخ جغرافیہ - اور علم نباتات پڑھاتا ہوں - کبھی کبھی سوکس ، انگریزی اور حساب بھی پڑھانا ہوتا ہے - تنخواہ پچاسی روپے ہے - گو رسید ایک سو پینتیس کی کاٹتا ہوں - عرصہ تیس سال سے اسی مدرسے میں اسی تنخواہ پر کام کر رہا ہوں - اخلاقاً میرا شمار انسانوں میں ہوتا ہے - گو جہاں تک آمدورفت کا تعلق ہے آپ مجھے عالم نباتات میں شامل کر سکتے ہیں - اور تنخواہ کے اعتبار سے میرا تعلق عالم جمادات سے ہے - کلاس کے اندر طالب علموں کی دھمکیاں سہتا ہوں - اور کلاس کے باہر ہیڈ ماسٹر اور مینجر اور بیوی کی گھرکیاں برداشت کرتا ہوں - اور چونکہ مجھے ہر روز اس قسم کی نگاہ سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس لئے اس نگاہ کو میں ہر جگہ پہچان جاتا ہوں - اس وقت بھی میں نے اس نگاہ کو فوراً پہچان لیا - جو گویا مجھ سے کہہ رہی ہے اے ذلیل کمینے دبلے پتلے مفلوک الحال انسان - تیری یہ مجال - کہ تو اس طرح میرے ساتھ میری سیٹ پر بیٹھے؟

اس نگاہ کے جواب میں میں مسکرا دیا - بڑی ہی پھیکی کھسیانی، اپنے آپ پر شرمندہ ہوتی ہوئی مسکراہٹ تھی - وہ گویا ہاتھ جوڑ کر اس آدمی سے کہہ رہی تھی - جانے دو بھائی ، مجھ سے کیوں الجھتے ہو - ایک غریب آدمی ہوں - بیٹھا ہوں بیٹھا رہنے دو - گرانٹ روڈ پر اتر جاؤں گا - تمہارا کیا لیتا ہوں - اس طرح گھور کر کیوں دیکھتے ہو - لو میں اور پرے ہوا جاتا ہوں !

میں نے کچھ کہا نہیں - لیکن اپنی سیٹ پر سمٹ کر اور سکڑ کر بیٹھ گیا - دوسرا آدمی اس اعتبار سے اور پھیل گیا - اس نے اپنے نتھنے پھلا کر مجھ سے پوچھا - ”کیا ٹائم ہے ؟“

میں نے بڑے مسکین لہجے میں کہا ”جی میرے پاس گھڑی نہیں ہے“ اور اس آدمی کے لہجے میں نخوت کی مقدار بڑھ گئی - جس طرح ذیابطیس کے مرض میں شکر کی مقدار بڑھ جاتی ہے - اس نے ہاتھ کے اشارے سے کنڈیکٹر کو اپنے پاس بلایا - اور

اُس سے وقت پوچھا۔ کنڈیکٹر نے وقت بتایا۔ تو اُس آدمی نے اپنی سونے کی گھڑی سے وقت ملاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری گھڑی غلط ہے؟"

"ہو گی صاحب!"

"ہو گی نہیں!" اُس آدمی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ہے، "تم بس کنڈیکٹر ہو۔ اور ٹھیک ٹائم نہیں رکھتے ہو۔ جبھی تو بسیں لیٹ ہوتی ہیں۔ یہ بس بھی دادر کے سٹاپ پر پانچ منٹ لیٹ پہنچی ہے۔ تم لوگوں کو مسافروں کا کوئی خیال نہیں رہتا۔ ہمارا کتنا ہرجہ ہوتا ہے؟"

"یہ بھی تو خیال کیجئے" کنڈیکٹر بولا۔ "آج کل برسات کا زمانہ ہے۔ دن بھر بارش ہوتی رہتی ہے۔ اگر ہم برابر سپیڈ سے گاڑی چلائیں۔ تو کتنے حادثے ہوا کریں۔ بھلے ٹائم سے پانچ منٹ بعد پہنچتے ہو۔ مگر گھر تو پہنچ جاتے ہو سیٹھ صاحب!"

کنڈیکٹر کی اس بات پر کچھ لوگ مسکرائے۔ میں تو مسکرانے کی جرائت بھی نہ کرسکا۔ کیوں کہ وہ آدمی میرے اس قدر قریب بیٹھا تھا۔ مگر اُس آدمی کی تسلی کنڈیکٹر کا جواب سن کر نہ ہوئی۔ اس نے فوراً سر ہلا کر کہا۔ "سپیڈ سے کیوں نہیں چلا سکتے؟ ضرور چلا سکتے تھے۔ مگر سڑکوں کی حالت دیکھتے ہو۔ بارہ بارہ انچ کے گڑھے۔ گاڑی کا ایکسل بھی ٹوٹ جائے اگر تیز چلے۔ ابھی ادھر ماٹنگا سے دادر آتے آتے میری گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ سالا، جدھر دیکھو۔ آجکل بے ایمانی کا راج ہے۔ پہلے سڑک پر کچے تہ کے اُوپر سیمنٹ کا ردہ جمایا جاتا تھا۔ اُس کے اوپر روڑی اور کولتار کی کارپٹنگ ہوتی تھی۔ آجکل خالی کچی مٹی کے تہ پر کارپٹنگ ہوتی ہے۔ چھ مہینے میں سڑک ٹوٹ جاتی ہے۔ ٹھیکے داروں کے مزے ہیں۔ شریف لوگوں کی گاڑیاں ٹوٹتی ہیں۔ سالا۔ ادھر جو ہے چور ہے۔ بے ایمان ہے۔ لٹیرا۔ ٹھگ اور دھوکے باز ہے۔"

اُس کے بعد اُس نے زیر لب بہت سی گالیا سنائیں وہ بہت خفا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا چہرہ سانولا اور چیچک زدہ تھا۔ بال سیاہ اور بھوئیں گھنی تھیں۔ چہرہ بھاری تھا اور جسم بھی بھاری تھا۔ اور کمر کے نیچے اُس نے ایسی شفاف دھوتی باندھ رکھی تھی

کہ اُس کی ریچھ کی سی ٹانگوں کا ایک ایک بال نظر آ رہا تھا۔
کنڈیکٹر نے اُس سے پوچھا۔ ”کہاں کا ٹکٹ؟“
”بامبے سینٹرل“
”ڈھائی آنے!“

سیٹھ نے اپنا بڑا بٹوہ کھولا۔ فراخ کشادہ بٹوہ! اُس بٹوہ سے چھوٹا تو میرا گھر تھا۔ جس میں اپنی بیوی اور پانچ بچوں اور ایک بوڑھی خالہ سمیت رہتا تھا۔ میں حسرت سے اس بٹوے کی طرف دیکھنے لگا کتنا بڑا بٹوہ تھا یہ۔ کتنے ہی تو اس میں کمرے تھے۔ ایک ہزار روپیوں کے نوٹوں سے بھرا تھا۔ ایک کمرہ سو روپیوں کے نوٹوں کے لئے تھا۔ ایک کمرہ دس روپئے کے نوٹوں کے لئے ایک کمرہ پانچ روپیوں کے نوٹوں کے لئے۔ ایک کمرے میں ریزگاری تھی۔ ایک کمرے میں ضروری کاغذات رکھے تھے بٹوے کے بیچ میں ریشم کی ڈوری تھی۔ یہ نوٹوں سے جگمگاتا ہوا بٹوہ ایک عالی شان محل کی طرح خوبصورت تھا میں تو اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ جیسے میں اُس حسین لڑکی کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ جو اب میری آنکھوں سے اوجھل تھی۔ میں دل ہی دل میں حساب کرنے لگا۔ تیس سال میں نے مدرس کا کام کیا۔ سال میں بارہ ماہ ہوتے ہیں۔ تو تیس سال میں تین سو ساٹھ مہینے ہوئے۔ ہر ماہ کی تنخواہ پچاسی روپئے ہوئی۔ تو مجھے اب تک کیا ملا۔ تیس ہزار چھ سو روپئے اس سے زیادہ کی رقم یہ سیٹھ اپنے بٹوے میں دبائے پھرتا ہے۔ میری پوری زندگی اس بٹوے میں تھی۔ سیٹھ نے ریزگاری کے خانے سے ڈھائی آنے نکالے۔ اور کنڈیکٹر کو دئیے۔ اور پھر بٹوہ بند کر کے اندر جیب میں رکھ لیا۔ اور یکایک میں نے اپنے آپ کو اُس کی جیب کے اندر جاتا ہوا محسوس کیا۔ اور یکایک میں اُس نگاہ کا مطلب سمجھ گیا۔ اوپر کا مطلب نہیں وہ باطن کا گہرا۔ تہوں کے اندر ہی اندر سماج کا چھپا ہوا وہ گھناؤنا راز سمجھ گیا۔ جو یہاں کی ہر کتاب اپنے طالب علم سے۔ اخبار اپنے پڑھنے والے سے ہر حاکم اپنے محکوم سے چھپاتا ہے۔ تم میری جیب میں ہو! تم میری جیب میں ہو! بٹوہ اندر کی جیب میں رکھ کے اُس آدمی نے پھر چوکنا ہو کر میری طرف دیکھا۔ اور مجھ سے پوچھا۔

"کہاں کام کرتے ہو ؟"
"گرانٹ روڈ پر ایک پرائیویٹ سکول میں ٹیچر ہوں۔"
"ٹیچر ہو کر گھڑی نہیں رکھتے ہو۔ تو وقت پر سکول کیسے جا سکتے ہو۔ وقت پر طالب علموں کو کیسے پڑھاتے ہوگے۔ مگر کس سے کہیں ؟" — وہ آدمی بہت برا منہ بنا کر بولا۔ حالانکہ اُس کا منہ اس سے پہلے بھی کچھ کم برا نہ تھا۔

"یہاں جو ہے کام چور ہے۔ کوئی کام سے جی چراتا ہے۔ تو کوئی وقت چراتا ہے۔ کسی کو دیش کا خیال نہیں ہے" ۔ میں نے کمزور لہجے میں کہا۔ "میں تو وقت ہی سے گھر سے چلا تھا۔ رستے میں دو بسوں پر باری نہ آئی۔ تیسری بس ملی۔ تو بارش ہونے لگی۔ اور ڈرائیور پھسلن سے ڈر کر بس آہستہ چلا رہا ہے۔ اب کیا کریں ؟"

"کیا کریں۔ جرمانہ ہونا چاہئیے تم ایسے لوگوں پر جرمانہ۔ اور کیا ؟ — مجھے دیکھو۔ میرا کرلہ میں بے داغ فولاد Stainless steel کا کارخانہ ہے ڈھائی سو مزدور کام کرتے ہیں وہاں۔ مگر کیا مجال جو کوئی وہاں ایک منٹ بھی لیٹ پہنچے۔ جرمانہ کر دیتا ہوں پگار میں سے کاٹ لیتا ہوں۔ یا اوور ٹائم کرنے کو کہتا ہوں مگر کس سے کہوں ؟ وہ تو میرا کارخانہ ہے یہاں کس سے کہوں ؟" سیٹھ نے جھنجھلا کر اپنی گھڑی کی طرف دیکھا پھر باہیے سنٹرل کی بڑی عمارت پر لگے ہوئے بڑے کلاک کی سوئیوں سے صحیح وقت کا اندازہ کیا اور زور سے سانس اندر کھینچکر چلایا۔

"میں تو دس منٹ لیٹ ہو گیا۔ اپنی اپوائینٹمینٹ ہے !!!"

"کیا فرق پڑتا ہے" ۔ میں نے ڈھارس دیتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "آپ سیٹھ صاحب ہیں۔ جہاں بھی جائینگے۔ لوگ آپکا انتظار کرتے ہونگے۔"

"انتظار میں بھی وقت ضائع ہوتا ہے مسٹر" ۔ سیٹھ نے مجھے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے میرے بزنس سے ہر منٹ پانچ روپے کا فائدہ ہوتا ہے۔ دس منٹ بیکار گئے تو سمجھو پچاس روپئے گئے۔ وقت روپیہ ہے مسٹر۔ وقت روپیہ ہے !!"

وقت کے متعلق انسان کے مختلف نظرئیے ہیں۔ وقت روپیہ ہے۔ وقت کون و مکاں کی چوتھی حد ہے۔ وقت کائنات کا چوکھٹا ہے۔

وقت شعور کا دھارا ہے۔ جو ماضی حال اور مستقبل کے گرد ایک دائرے کی صورت میں گھوم رہا ہے۔ وقت ایک بوڑھا ہے۔ جسے صرف اُس کے ماتھے کے بالوں سے پکڑا جاسکتا ہے۔ وقت شب انتظار ہے۔ یا انبساط وصال! کسی کا پہلا بوسہ ہے۔ تو کسی کی آخری ہچکی کسی کے لئے تخت ہے تو۔ کسی کے لئے تختہ! مگر یہ سب تاویلیں غلط ہیں۔ وقت ایک بٹوہ ہے۔ جس میں ایک مدرس کی تیس سالہ زندگی کے ایام بند ہیں!!

میں نے بڑے حسرت ناک لہجے میں سیٹھ سے پوچھا۔ ''سیٹھ یہ۔بے داغ فولاد کیا ہوتا ہے۔ جس سے تم فی منٹ پانچ روپے کماتے ہو۔''

''ٹیچر ہوکر یہ نہیں جانتے؟ ارے تم کیا خاک ٹیچر ہو۔ کیا پڑھاتے ہوگے تم اپنے طالب علموں کو۔ ارے بدھو۔ یہ بے داغ فولاد Stainless Steel ہوتا ہے اسے زنگ نہیں لگ سکتا۔ اُس کے برتن بنائے جاتے ہیں۔ یہ گھڑی جو تم میرے ہاتھ میں دیکھ رہے ہو۔ یہ بھی اُسی بے داغ فولاد کی ہے۔ اس کا رنگ کبھی خراب نہ ہوگا۔ اسے مٹی میں ڈال دو۔ پانی میں پھینک دو۔ اس پر کسی چیز کا کوئی اثر نہ ہوگا۔''

''کمال ہے بھئی۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''تو کیا صرف برتن اور گھڑیاں ہی بے داغ فولاد کی بنتی ہیں۔''

''نہیں۔'' سیٹھ نے میری لاعلمی پر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سینکڑوں چیزیں بے داغ فولاد کی بنتی ہیں۔''

''تو انسان بھی بنتے ہونگے؟'' میں نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونکا۔

''ایسے انسان جن پر کسی چیز کا کوئی اثر نہ ہوتا ہو۔ بے داغ فولاد کے انسان!'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ وہ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

میں نے اُس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاکے کہا۔ سیٹھ تم بھی مجھے بے داغ فولاد کے انسان معلوم ہوتے ہو۔ ایسا انسان جس میں کہیں پر کوئی سقم اور خامی نہ ہو۔ کس قدر سچے اور دیانت‌دار۔ مضبوط اور وقت کے پابند۔ سچ کہتا ہوں۔ اگر میرے بس

میں ہو۔ تو میں تمہارے ایسے انسان کو ہندوستان کا ڈکٹیٹر بنا دوں۔" وہ میری تعریف سے بہت خوش ہوا۔ بولا۔ "میں دوسال میں ہندوستان کی کایا پلٹ کے رکھ دوں۔ سارا ملک ایک کارخانے کی طرح کام کرنے لگے۔ ہر انسان مشین کی طرح چلنے لگے۔ میں تو سب کو دو دن ہی میں ٹھیک کرکے رکھدوں۔ مگر کیا کروں۔ آج کل تو جدھر دیکھو۔ جنتا راج! جنتا راج کی بکواس سنتا ہوں۔ ہوں جنتا راج!

اتنے میں گرانٹ روڈ کا اڈہ آگیا۔ اور میں وہاں اُترنے لگا وہ بھی میرے ساتھ ساتھ نیچے اُتر آیا۔ یکایک مجھے کچھ خیال آیا۔ تو میں نے پلٹ کر اُس سے کہا۔ "سیٹھ آپ مجھسے باتیں کرتے کرتے غلطی سے یہاں گرانٹ روڈ تک چلے آئے۔ حالانکہ آپ کو پچھلے اڈے پر بامبے سنٹرل پر اُترنا تھا۔"

وہ ہنس کر وہ بولا۔ "نہیں در اصل مجھے گرانٹ روڈ ہی پر اُترنا تھا۔ میں ہر روز یہیں پر اُترتا ہوں۔ ایک ڈھائی آنے کا ٹکٹ بامبے سنٹرل کا لیتا ہوں۔ اور یہاں گرانٹ روڈ پر آکے اُتر جاتا ہوں۔ ہر روز ٹکٹ میں دو پیسے کی بچت ہو جاتی ہے۔ یہاں کون دیکھتا ہے؟"

اتنا کہہ کے اُس نے مجھے آنکھ ماری۔ اور جلدی جلدی نکڑ سے گھوم کر غائب ہو گیا۔



عصمت چغتائی

کنواری

اسکی سانس پھولی ہوئی تھی ۔ لفٹ خراب ہونے کی وجہ سے وہ اتنی بہت سی سیڑھیاں ایک ہی سانس میں چڑھ آئی تھی ۔ آتے ہی وہ بے سدھ پلنگ پر گر پڑی اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کو کہا ۔

میں خود خاموش رہنے کے موڈ میں تھی مگر اسکی حالت بد دیکھ کر مجھے پریشان ہونا پڑا ۔ اسکا رنگ بیحد میلا اور زرد ہو رہا تھا ۔ کھلی کھلی بے نور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور بھی گہرے ہو گئے تھے ۔ منہ پر میک اپ نہ تھا ۔ خاص طور پر لپسٹک نہ ہونے کی وجہ سے وہ بیمار اور بوڑھی لگ رہی تھی ۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے بتائے ہوئے ڈاکٹر کا علاج تسلی بخش ثابت ہوا ۔ اسکا پیٹ اندر کو دھنسا ہوا تھا اور سینہ سپاٹ ہو گیا تھا ۔ مجھے ایسا معلوم ہوا اس قتل کی میں بھی کچھ ذمہ دار ہوں ۔ مگر میں ڈاکٹر کا پتہ نہ بتاتی تو کوئی اور بتا دیتا ۔ بن بلائے مہمان کو ایکدن نکالا تو ملنا ہی تھا ۔

" ایک مشورہ لینے آئی ہوں ۔ " سانس قابو میں آتے ہی اسنے کہا ۔

" جمعہ جمعہ آٹھ دن بیتے نہیں اور مردار کو پھر مشوروں کی ضرورت آن پڑی ۔ " میں نے چڑ کر سوچا ۔ مگر نہایت خندہ پیشانی سے کہا ۔

" لو ضرور لو آجکل بہت مشورے میرے دماغ میں بجبجا

رہے ھیں ۔"

" آپا میں شادی کرلوں" ۔ اسنے بڑی لجاجت سے پوچھا گویا اگر میں نے اجازت نہ دی تو وہ کنواری ارمان بھری مرجائے گی ۔

" مگر تمہارا شوھر ؟"

" موت آئے حرامی پلے کو ۔ اسے کیا خبر ھوگی ۔"

" یہ بھی ٹھیک کہتی ھو ، بھلا تمہارے شوھر کو تمہاری شادی کی کیا خبر ھوگی ۔" میں نے سوچا ۔ " مگر تمہاری شادی کے چرچے اخباروں میں ھونگے ۔ آخر اتنی بڑی فلمسٹار ھو ۔"

" فلمسٹار کی دم میں ٹھنگا ۔" اللہ گواہ ھے مجھے نہیں معلوم کہ یہ گالی ھوئی کہ نہیں ۔ مدن ایک سانس میں تین گالیاں بکنے کی عادی ھے ۔ مجھے تو اسکی زبان سے نکلا ھوا ھر لفظ گالی جیسا سنائی دیتا ھے ۔ مگر یہ حقیقت ھے کہ سوائے چند عام فہم گالیوں کے یہ گلکاریاں میرے پلے نہیں پڑتیں ۔

"بھئی ایک بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی ۔" میں نے بات کی لگام ایکدم دوسری سڑک پر موڑ دی ۔ " تم شادی شدہ ھو تو پھر تمہارا بچہ حرامی کیسے ھوا ؟ ۔"

" آنہ آپا اللہ کا واسطہ کبھی تو سمجھا کرو ۔ کمبخت شادی تو شبو دو سال کا تھا تب ھوئی تھی ۔"

" شبو کے باپ سے ھی نا ۔" میں نے سہم کر پوچھا ۔

" آنہوں ، تمہیں یاد تو کچھ رھتا نہیں ، بتایا تو تھا ۔ ۔ ۔ وہ کمبخت ۔ ۔ ۔"

" اچھا ۔ ۔ ۔ یاد آگیا ۔ ۔ ۔ وہ تمہیں گرھستی کا شوق چرایا تھا " ۔ میں نے اپنی کند ذھنی پر شرمندہ ھوکر کہا ۔

" بھوسہ چرایا تھا ۔ ماں کے خصم نے دھندا کرانا شروع کر دیا" ۔ پتہ نہیں ماں کا خصم رشتہ میں کیا ھوا ۔

" آنہ چھوڑو اس نامراد شادی کا، نئی شادی کا ذکر کرو ۔ اللہ رکھے کب کر رھی ھو، کون ھے وہ خوش نصیب ؟"

" سندر ! " اور وہ قہقہہ مار کر قالین پر لوٹ گئی ۔

ایک ھی سانس میں اسنے سب کچھ بتا ڈالا ۔ کب عشق ھوا کیسے ھوا اب کن مدارج سے گذر رھا ھے ۔ سندر آسکا کس بری

طرح دیوانہ ہو چکا ہے ۔ کسی فلم میں کسی دوسرے ہیرو کے ساتھ لو سین نہیں کرنے دیتا ۔ اور وہ خود بھی اُسے کسی دوسری ہیروین کے ساتھ رنگ رلیاں نہیں منانے دیتی ۔

" آپا یہ فلم والیاں بڑی چھنال ہوتی ہیں ۔ ہر ایک سے لنگر لڑانے لگتی ہیں ۔ " اُسنے ایسے بھولپن سے کہا جیسے وہ خود بڑی پارسا ہے ۔ آپا کوئی چٹپٹی سی کہانی لکھو ہم دونوں اسمیں مفت کام کریں گے ۔ مزا آجائے گا " اسنے چٹخارہ لیا ۔

" سنسر سب کاٹ دے گا ۔ "

" سنسر کی ۔ ۔ ۔ " اُسنے موٹی سی گالی سنسر کی قینچی پر داغی ۔ " شادی کے بعد کام تھوڑی کروں گی سندر کہتا ہے اپنی دلہن کو کام نہیں کراؤنگا ۔ چمبور میں بنگلہ لے لینگے " ۔ خوابوں کے جھولے میں پینگ لیتے ہوئے کہا اور ایکدفعہ تو مجھے بھی یقین ہو گیا کہ اُسکی دنیا بس جائے گی ۔ چمبور بنگلے میں وہ بیگم بنی بیٹھی ہو گی ۔ بچے اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہونگے ۔ "

" اماں کھانا، اماں کھانا " وہ چلائیں گے ۔

" اے ہے ذرا تو صبر کرو ۔ ۔ آلو تو گل جانے دو ۔ " وہ کفگیر سے اُنہیں مارے گی ۔

تب بچوں کا باپ مسکرائے گا ۔ " بیگم کیوں مارتی ہو ۔ ابھی بچے ہیں ۔ "

" بس ایک لونڈا ہو جائے پھر سالے کو شادی کرنی پڑے گی ۔ "

" تو کیا ابھی شادی طے نہیں ہوئی ۔ " خوابوں کی بستی سے لوٹ کر میں نے پوچھا ۔ میرا دل بیٹھ گیا جیسے میری اپنی کنواری کی بارات دروازے سے لوٹ گئی ۔

" نہیں آپا ۔ حرامزادہ ہے بڑا چالاک نہ جانے کیا کرتا ہے ۔ " وہ دیر تک سندر کو پھانسنے کی ترکیبیں پوچھتی رہی ۔ نہ جانے کیوں یہ بات اُسکے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ اگر بچہ ہو گیا تو سندر کے پیر میں بیڑیاں پڑ جائیں گی ۔

" اور پھر بھی اُسنے شادی نہ کی تو ؟ "

" کرے گا کیسے نہیں اُسکا تو باپ بھی کرے گا ۔ "

" خیر باپ کا ذکر فضول ہے وہ مر بھی چکا ۔ "

" حرامزادے کی چھاتی پر چڑھ کے خون نہ پی جاؤنگی ۔"
" شبو کے باپ کی چھاتی پر چڑھ کے کیوں نہ خون پی گئیں ۔"
" جب میری عمر ھی کیا تھی ۔ اُلٹی چور سی بن کے بیٹھ گئی ۔ بس تم کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ سالے کی ایک نہ چلے اور ۔ ۔ ۔" جو ترکیبیں وہ مجھسے پوچھ رہی تھی اُنسے مجھے سخت وحشت ہو رہی تھی ۔

مدن کئی بار سندر کو لیکر میرے ھاں آئی ۔ سندر اپنے نام کی طرح حسین اور نو عمر تھا ۔ مدن سے کسی طرح بڑا نہ معلوم ہوتا تھا ۔ نیا نیا کالج سے آیا تو بھو کے بنگالی کی طرح چوسکھے عشق لڑانے شروع کر دئے ۔ اسی چھین جھپٹ میں مدن اُسے اُڑا لائی ۔ اچھے گھرانے کا قہقہہ باز اور باتونی لڑکا پہلی ھی دفعہ گھر میں ایسا بے تکلف ہو گیا جیسے برسوں سے آتا جاتا ہے ۔

اُسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ کیوں مدن اُسے دل دے بیٹھی ۔ اُسکی صحبت میں ایک لمحہ بھی اداس نہیں گزرتا تھا ۔ مدن جیسی پٹی پٹائی غم نصیب لڑکی کے لئے تو ذرا سی نرمی بھی چھلکا دینے کو کافی تھی ۔ وہ سندر کے ہر جملے پر بے تحاشہ قہقہے لگاتی ۔ وہ بات پر نہیں اُسکے چہرے کے اُتار چڑھاؤ پر، لبوں کی جنبش پر مسحور ہوکر کھلکھلا پڑتی ۔ مسرت کی اچھلتی کودتی موجیں اُسے جھکول ڈالتیں ۔ سندر کے لب ہلتے اور وہ قہقہہ مارتی ۔ پانی پیتی ہوتی تو اچھو لگ جاتا کھانا کھاتی ہوتی تو منہ کا نوالہ سامنے بیٹھنے والے کے اوپر چھڑک دیتی ۔

وہ دونوں نہ جانے اپنا گھر چھوڑ کر میرے ھی ھاں کاہلیں کرنے کیوں آتے تھے ۔ بچوں جیسی شرارتیں کرتے قلابازیاں کرتے ۔ کبھی روٹھتے کبھی منتے ۔ انہیں دیکھکر مجھے بکری کے وہ کھلنڈرے بچے یاد آجاتے جو پرائے کھیت میں پھدکنے آجاتے ھیں ۔ کیا دندناتا ہوا عشق تھا دونوں کا بےپروں کے ہوا میں اُڑے جاتے تھے ۔

جنگلی ہرنیوں جیسے چوکڑیاں بھرتے ہوئے پیار نے مدن کی کایا پلٹ کردی ۔ وہ ایکدم بیحد حسین اور جاذب نظر بن گئی ۔ جلد کے نیچے دئے روشن ہو گئے ۔ سوئی ہوئی آنکھیں جاگ اُٹھیں ہزاروں جادو سر گوشیاں کرنے لگے ۔ سپاٹ سینہ کھل اُٹھا اور

کولہے لہرانے لگے ۔ سندر سے کشتیاں لڑ لڑ کر وہ پھر بیلی ہو گئی ۔

سندر اور مدن کی جوڑی بن گئی ۔ جن فلموں میں وہ سندر کے ساتھ نہ تھی انہیں ڈفرانا شروع کر دیا ۔ سیٹ سے بڑے معرکے کے سین میک اپ روم میں ہونے لگے ۔ وہ فلمیں جو آدھی ہو گئی تھیں چیتھڑا ہو گئیں ۔ مدن نے پہلی بار کسی نوجوان کو دل دیا تھا ۔ سب کچھ بھولکر وہ اسی میں ڈوب گئی ۔

سندر اسکے بڑے لاڈ سہتا ۔ اسکے چھچھورپن پر ہنستا اسکے اجڑے ہوئے گھر میں جا کر جان ڈالدیتا ۔ نانی کو اماں اماں کہہ کر مسکا لگاتا ۔ خالہ سے بیٹھ کر گپیں مارتا ۔ بھائی کو وھسکی پلاتا ۔ بچوں کے ساتھ دھماچوکڑی مچاتا ۔ اسے مدن کے جسم سے مطلب تھا اسکی آمدنی اسی طرح منہ بولے رشتہ داروں کے تنور میں جھونکی جاتی تھی شبو کو وہ بہت پیار کرتا ۔ مدن نے اس بدنصیب بچہ کا حال اسے سنا دیا تھا ۔ اسے بیٹا کہہ کر گود میں بٹھا کر گھنٹوں پیار کی باتیں کیا کرتا ۔

”آپا شبو نگوڑے کو بیٹا کہتی ہے ، بس تم ہی سمجھ لو کیا بات ہے ۔“ وہ جھوم کر کہتی اور میرے کانوں میں مدن کی بارات کے ڈھول گونجنے لگے ۔ دیکھنے میں سندر کیسا لاوبالی سا تھا ۔ مگر بچوں کے معاملے میں اسکا رویہ حیرت انگیز تھا ۔ آتے ہی بچے اسے مکھیوں کی طرح گھیر لیتے ۔ اسکی جیبیں کیا تھیں عمرعیار کی زنبیل تھیں ۔ رنگین پنسلیں ، پٹاخوں کی ڈبیاں ، کاغذ پر اتارنے کی تصویریں چوکلیٹ میٹھی گولیاں نہ جانے کیا الا بلا نکالکر بانٹنے لگتا ۔ ایکدن بچی نے میری سینٹ کی شیشی توڑ دی میں نے اسے مارنا چاہا تو وہ میرے ھاتھوں سے اسے جھپٹ لے گیا ۔

”آپ ماریں گی تو اسے اپنے گھر لے جاؤنگا ۔“ وہ اسے کندھے پر بٹھا کر بولا ۔

”اسنے میری شیشی توڑی ہے ضرور مارونگی ۔“

”ھاتھ توڑ دئے جائیں گے مارنے والوں کے ۔ یہ لیجئے اپنی شیشی ۔“ اسنے جیب سے نئی منہ بند ویسی ہی شیشی نکال دی ۔ ”مگر انہیں پوری شیشی نہیں دیں گے ۔ آدھی تھی بس آدھی ملے گی ۔“ اسنے شیشی کھولکر خوب بچوں کے بساندے کپڑوں اور

میلی ہتھیلیوں پر چھڑکی آدھی رہ گئی تو میرے سامنے ڈالدی ۔
جب وہ بچوں کو بٹور کر دوسرے کمرے میں چلا گیا تو مدن نے رو کر میرے شانے پر سر ڈالدیا ۔

’’ آپا ایسے اوٹ پٹانگ آدمی کے ساتھ کوئی پیار کیسے نہ کرے ،،

اور پھر مدن کی زندگی نے ایک نیا جھٹکا کھایا ۔ سندر کے گھر سے تار آیا کہ ماں سخت بیمار ہے فوراً آجاؤ ۔ مدن ساتھ جانے کے لئے مچل گئی ۔ اسنے اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کرڈالے ۔ شام سے ہی اسکے لئے وھسکی کی بوتل لیکر پہونچی ۔ اسے دھت کر دیا ۔ بڑے نازک لمحوں میں ساتھ لیجانے کی قسمیں دیں مگر سندر ٹس سے مس نہ ہوا ۔ وہ ساری رات جاگتی رہی ۔ نہ سوئی نہ سونے دیا ۔ مگر صبح ہوتے ہی پرندہ ساری تیلیاں جھٹک کر اڑ گیا ۔

ایروڈروم سے سیدھی میرے اوپر نازل ہوئیں ۔ مجھے اس قسم کے مریل عاشقوں سے بڑی کوفت ہوتی ہے مگر اسے یوں تباہ حال دیکھ کر میرا جی پسیج گیا ۔ جیسے برسوں کی بیمار ایک ہی رات میں آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے منہ پر پھٹکار ۔ یہ اسے کیا ہو گیا ہے میں دیر تک سوچتی رہی ۔

میں کیوں اس کمبخت کے بارے میں سوچوں ۔ دنیا میں کتنے بڑے بڑے مسئلے ہیں جن میں جی الجھا ہوا ہے پھر آخر میں اس کا خیال کیوں کرتی ہوں میں یہ سب کچھ کیوں لکھ رہی ہوں ۔ مدن اس لائق نہیں مجھے اپنا جی ہلکا کرنے کے لئے ہی سہی اس بوجھ کو بانٹنا ہوگا ۔

کتنے دن سے میں جب قلم اٹھاتی ہوں مدن کا خیال مجھ سے آکر کہتا ہے ۔ ’’ میں زندہ ہوں ۔ میرے سینے میں دل دھڑک رہا ہے ۔ میری رگوں میں خون دوڑ رہا ہے ۔ رائے دو ۔ ۔ ۔ مجھے بتاؤ میں کیوں ہوں ، کیا ہوں ، اور کبتک رہوں گی ۔ ،، اچھا ہے میرا قلم ایکبار مدن کو اگل دے پھر متلیاں آنی بند ہو جائیں گی ۔

’’ آپا ایک تار لکھو ۔ ،، اسنے تھوڑی دیر سوکھی سوکھی آہیں بھر کے کہا ۔

’’ کیسا تار ،،

’’ کم سون ڈائینگ ۔ ،، یعنی جلدی آؤ مر رہی ہوں ۔

"مگر ابھی تو وہ پھونچا بھی نہوگا۔" میں نے ٹالنا چاھا پھر جان کو آگئی تو لکھدیا۔ ڈائینگ نہ لکھا۔

"شامکو ھانپتی کانپتی آئیں۔ بڑی شرماتی ہوئی تکیہ میں منہ چھپاکر ھنسنے لگیں۔ میں نے کہا "خیریت؟"

"تار لکھ دو۔"

"صبح لکھا تو تھا۔"

"صبح مجھ نصیبوں جلی کو کہاں معلوم تھا۔"، وہ پھر شرمائیں۔ "ابکائیاں آرھی ھیں۔ آپا لیمو منگوادو۔"

"آھو۔۔۔ یہ بات ھے۔ مبارک ھو۔"، میرے سر سے بوجھ سا آتر گیا۔ یوبس پھٹکی کامیاب رھی۔ "ڈاکٹر کے پاس گئیں۔"

"وھیں سے تو آرھی ھوں۔ ڈاکٹر حرامی پلا کیا جانے کہتا ھے دو دن چڑھ جانے سے کچھ نہیں ھوتا۔ کچھ نہیں ھوتا کا بچہ۔"

"آپا کپڑے وغیرہ تو سلوا دوگی۔ ھنک ھنک بھئی ھم سے نہیں پلے گا تم پال دوگی؟۔" وہ ٹھنکنے لگی۔ میں نے حامی بھر لی۔

"تو پھر تار لکھو نا۔"

"کیا لکھوں۔"

"لکھو۔ سن بورن کم سون۔"

"گدھی ھو تم"، ابھی کہاں سے "سن بورن۔"

"اچھا تو سن بورن ھونے والا لکھ دو۔"

"چلو سڑن۔ اسکے آنے کا انتظار کرو۔ اور کیا معلوم شاید لڑکی ھو۔"

"واہ لڑکی چھنال کا ھے کو ھوگی میری طرح سڑنے کو۔ میرا جی کہتا ھے لڑکا ھی ھوگا۔" پھر تھوڑی دیر سوچ کر ایکدم بولیں۔

"مرجائے اللہ کرے۔"

"کون؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"سندر کی اماں آلو کی پٹھی۔ بیمار ویمار کچھ نہیں سسری نے اپنے یار کو بلانے کے لئے ڈھونگ رچایا ھے۔" آسنے نہایت پر مغز قسم کی پھولدار گالیاں ٹکائیں۔

"احمق ہو تم، کیسے معلوم۔"

"ارے میں خوب جانتی ہوں ان میت پیٹیوں کو۔"

جب سے مدن کی زندگی میں سندر آیا تھا اسنے گالیاں بکنا بند کردی تھیں۔ سندر کے پیار نے رستے زخموں پر پھائے رکھ کر غلاظت کا منہ بند کردیا تھا۔ اسکے آنکھ اوجھل ہوتے ہی کچے زخموں کے منہ کھل گئے۔ پیپ بہنے لگی۔ اسکے منہ سے پھر وہی گالیاں سنکر میرا جی بیٹھ گیا۔ مارے غصہ کے مدن پٹاخوں کی لڑی بن گئی۔

"اسکا تعلق ہے۔"

"کسکا؟"

"اس کی اماں بہنیا کا۔ سچی آپا بہت سی عورتیں ایسی ہوتی ہیں بچپن ہی۔۔۔"

"لعنت ہو تمہاری زبان پر۔"

"اللہ قسم آپا۔۔۔ ہمارے پڑوس میں ایک بیوی رہتی تھیں۔ اپنے سگے بھائی سے۔۔۔"

میں نے اسے روکدیا۔ للہ تفصیلوں میں نہ جاؤ۔ میرا قلم پیٹ کا بڑا ہلکا ہے۔ کل کلاں کو منہ سے بات نکال بیٹھا، تو لوگ تو مجھے آلاھنا دیں گے۔

دوسرے دن ماتم کناں پھر ٹوٹ پڑیں۔ کل جیسے ڈاکٹر کا کہنا ہی ٹھیک نکلا۔ دن چڑھ گئے تھے سو اتر گئے۔ ساتھ ساتھ مدن کی کمان بھی اتر گئی۔ ایسی بلک بلک کے روئیں جیسے جوان بیٹا جاتا رہا ہو۔ یہ عورت ہے یا لطیفہ کل جس بلا کے خوف سے بوکھلائی پھر رہی تھیں آج اس بلا کی آرزو میں جان دئے دیتی ہیں۔ لگیں مجھسے ترکیبیں پوچھنے۔ بھلا میرے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہے جو چوہے کو گھوڑا بنا دوں۔ ڈاکٹر نے کچھ اشارہ تو کیا تھا کہ اب آئندہ اس مصیبت سے پالا نہیں پڑے گا۔ میں اسے باوجود کوشش کے نہ بتا سکی کہ سندر کو پھانسنے والی چال کے پیر مفلوج ہو چکے ہیں۔

صبح شام تاروں کی مدن نے ڈاک بٹھا دی۔ کام پر اسنے لات مار دی ایک پروڈیوسر نے کورٹ میں لیجانے کی دھمکی دی تو وہ ناک پر ڈھیر سارا مرھم تھوپ کر پڑ گئی۔ میں بھی مرھم

کی مقدار دیکھ کر دھل گئی - گئی ناک ، میں نے سوچا - مگر جب پروڈیوسر چلا گیا تو مزے سے ناک پونچھ کر ہنسنے لگیں -

" مگر مجھے بیوقوف کیوں بنایا تم نے " میں نے چڑ کر کہا اور چلی آئی -

اخباروں میں اسقاط کی خبریں چھپنے لگیں - مدن نے ذرا شرما کر تصدیق کردی - میں نے پوچھا یہ کیوں ؟

" سور کو پتہ چلے گا تو بہت کڑھے گا - میں کہدونگی میں سمجھی تم چھوڑ کے چلے گئے بدنامی کے ڈر سے گولیاں کھالیں - مرد بچہ ہے کچھ تو دل کو ٹھیس لگے گی - "



ایکدن حواس باختہ روتی ہوئی آئیں -

" تم نے مجھے نہیں جانے دیا - یہ دیکھو " وہ اخبار جسمیں سندر کی منگنی کی خبر تھی دکھا کر لڑنے لگیں -

" چہ خوش میں نے کب منع کیا - " میں نے جل کر کہا - " جاؤ میری بلا سے جہنم میں - " اور وہ شام کے ھوائی جہاز سے جہنم کی طرف اڑ گئیں -

گیارہ بجے راتکو جب وہ سندر کے گھر پہونچیں تو گھر میں سوائے بوڑھے دادا اور طوطے کے کوئی نہ تھا سب کے سب سندر کی کوئی فلم دیکھنے گئے ہوئے تھے - سندر کے دادا فلم لائین کے ویسے ہی خلاف تھے - انہیں معلوم تھا کہ ان فلم والوں کے چال چلن کچھ یونہی ورق سے ہوتے ھیں - پھونک ماری اور غائب - آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ مدن کو گھورنے لگے - مدن بمبئی سے گرم

کپڑے بھی لیکر نہیں گئی تھی - بھوک الگ لگ رہی تھی -
بارہ بجے کے بعد سندر بہن بھائیوں کی ٹولی میں ہنستا قہقہے لگاتا آیا تو مدن روپڑی - کیا وہ بھی کبھی یوں خاندان میں گھل ملکر انکی اپنی بن سکے گی - اسکے بھی دیور جیٹھ ہونگے نندیں اور دیورانیاں ہونگی -

" بہو لڑکا رو رہا ہے بھوکا ہے -" ساس کہے گی - اسنے پکا ارادہ کرلیا وہ اپنی ساس سے کبھی نہیں لڑے گی - نندوں کی خوب خاطر کرے گی - دادا کا حقہ بھرے گی اور طوطے کو بھیگے چنے کھلائے گی - سندر کو دیکھ کر اسکا جی چاہا دوڑکر اسکے چوڑے چکلے سینے سے لپٹ جائے اور اسے مٹھیوں سے کوٹ ڈالے - اسکے بھورے گھنے بالوں میں انگلیاں ڈال کر نوچ ڈالے - مگر 'ساس' 'نندوں' کی شرم نے اسکے پیر تھام لئے -

اسے دیکھ کر سندر کے حلق میں قہقہہ لوہے کا گولہ بنکر اٹک گیا ، ماں بیٹوں کے سامنے وہ اپنی داشتہ کے وجود سے شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا - مصنوعی خوش مزاجی سے بولا -

" ارے آپ !"

" آپ کے بچے !" مدن نے دانت پیسے مگر سندر کی گھبراہٹ پر ترس کھا گئی -

" جوہری سے کچھ زیور بنوائے تھے - چاندنی کندن کا کام دلی جیسا بمبئی میں نہیں ہوتا - سوچا دلی کی سیر بھی ہو جائے گی اور زیور بھی دیکھ لونگی -" سندر مدن کی اعلیٰ ایکٹنگ کا قائل تھا آج تو لوہا مان گیا -

جب اسے سندر کی بہنوں کے کمرے میں سلایا گیا تو وہ بمشکل گالیوں کی زنجیر کو نگل سکی جو اسکے حلق میں الجھنے لگی - خیر جب سب سو جائیں گے تو سندر اسکے پاس آئے گا - سب سو گئے اور وہ سندر کے پیروں کی چاپ کے انتظار میں پڑ رہی - اسکا جسم سندر میں جذب ہونے کے لئے ترس رہا تھا - راستے بھر کیسے کیسے خوابوں کے جال بنتی آئی تھی - سندر سو رہا ہو گا وہ چپکے سے پہلو میں رینگ جائے گی - اسے محسوس کر کے سندر جھوم اٹھے گا - پہلے وہ خوب ترسائے گی خوب روٹھے گی - پھر دونوں من جائیں گے ساری کسک ساری دوری مٹ جائے گی -

سارے راستہ وہ اسی حسین حادثہ کو دلمیں دھرا کر چٹخارے لیتی آئی تھی - اسی لئے تو وہ اپنی جھاگ سی نائٹی لیتی آئی تھی جو ہاتھ کے لمس سے دھوئیں کی طرح پگھل کر غائب ہو جاتی تھی۔

مدن سندر کے پیروں کی چاپ سننے کے لئے بیقرار ہمہ تن گوش بن گئی - دبے پیروں وہ پلنگ سے اُٹھا ہوگا اسنے منظر نامہ تعمیر کرنا شروع کر دیا - اسکی طرف کھنچا چلا آرہا ہوگا - ایک - دو - تین - چار پانچ اسنے اندازے سے وہ سارے قدم گن ڈالے جو اسکے اور سندر کے درمیان حائل تھے - گنتے گنتے وہ تھک گئی - اگر وہ ہزار میل پر ہوتا تو ابتک پہونچ چکا ہوتا - وہ روہانسی ہو گئی - احساس کے تناؤ سے کنپٹیاں بھیگے چمڑے کی طرح کسنے لگیں - شاید سندر کے بھائی جاگ رہے ہونگے اور وہ انکی موت کی دعائیں مانگنے لگی -

سندر کی گلگوتھا سی بھولی بھالی بہنیں کیا میٹھی نیند سو رہی تھیں - انکے خواب کتنے سہانے تھے - انکے دلوں میں کسی بے وفا کے پیار کے زخم نہیں پڑے تھے - اسے غصہ آنے لگا - اے کاش کوئی انکا جہان بھی لوٹ لے ، ان کے پیٹوں میں سانپ چھوڑ دے کہ یہ بھی گھور اندھیارے میں کسی کے پیروں کے نشان ٹٹولتی پھریں - پھر سندر کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو -

آخر کس جرم کی سزا میں اسکا بچپن اتنا ویران اور جوانی زخم زخم ہوکر رہ گئی تھی - اس سے زیادہ نہ ضبط ہو سکا اور وہ سندر کے کمرے کی طرف چلنے لگی جہاں وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ سو رہا تھا -

وہ جیسے ہی باہر نکلی طوطا اجنبی صورت دیکھ کر آنکھوں کے لٹو گھمانے لگا -

" کون " دادا نے ہانک لگائی - وہ چوروں کی طرح کھمبے کے پیچھے دبک گئی - دادا اُٹھے اور چبوترے پر کھڑے آدھ گھنٹھ تک رفع حاجت کرتے رہے - مر گیا بڈھا شاید کہ ہلتا ھی نہیں - وہ سائے سائے پھر چلی - ایک پیڑھی سے پیر الجھا اور دھڑام سے گری - گھر میں جگار ہو گئی اور وہ پھر اپنے پلنگ پر جا کر دبک گئی -

صبح موقع پاتے ھی اسنے سندر سے کہا - "سیدھی طرح

بمبئی چلو بیٹا ورنہ خون خراب ہو جائیں گے۔"
" تم نے تار تو دیا ہوتا۔ کسی ہوٹل میں انتظام کرا دیتا۔"
" کیوں، کیا جاگیر میں ٹوٹا آیا جا رہا ہے۔ مرے کیوں جاتے ہو کھانے کے پیسے لے لینا۔"
" داموں کی بات نہیں میری جان، میرے گھر والے بڑے نیرومائنڈڈ ہیں۔ فلم والوں کو پسند نہیں کرتے۔"
" تم بھی تو فلم والے ہو۔"
" میری اور بات ہے تم شام کی گاڑی سے چلو پرسوں میرے بہنوئی آرہے ہیں انسے ملکر۔۔۔"
" تو میں بھی نہیں جاؤنگی۔" بڑی جھک جھک کے بعد یہ طے ہوا۔ مدن بظاہر بمبئی کے لئے روانہ ہو جائے ایک سٹیشن بعد نئی دلی پہ آتر کر کسی ہوٹل میں ٹھہر جائے۔ سندر وہیں آجائے گا۔ بڑی دھوم دھام سے سارا گھر مدن کو سٹیشن پہونچانے گیا۔ وہ ایکدم فلمسٹار بنگئی۔ چھوٹے بھائیوں نے تو ہار بھی پہنائے۔
نئی دھلی پہ آتر کر وہ ہوٹل میں ٹھر گئی۔
دو پیاسے انسان ایکدوسرے میں غرق ہوگئے۔ مدن کے سارے دکھ دور ہو گئے۔ وہ انتظار کی گھڑیاں وہ لامتناھی فاصلہ سب سندر کے پیار نے پاٹ دیا۔ مگر باوجود خوشامد کے سندر رات گزارنے پر راضی نہ ہوا۔
" میری ماں میرے بغیر رات بھر بنا کھائے بیٹھی رھیں گی۔"
" تمہاری اماں کی۔۔۔" وہ موٹی سی گالی چبا گئی۔ سندر کی جان کو آگئی۔ اسکے کپڑے چھپا دئے اسکے جوتے گود میں دبا کر بیٹھ گئی۔ دس مرتبہ دروازے سے بار بار خدا حافظ کہنے کو بلایا۔ مگر جانے والے کو نہ روک سکی، وہ اسے سونے اجنبی بستر پر سسکیاں بھرتا چھوڑ کر چلا گیا۔
دوسرے دن سندر حسب وعدہ آگیا۔ مدن نے پورا بکس بیئر کی بوتلوں کا برف میں لگا کے رکھا تھا۔ آتش دان میں دھیمی دھیمی آنچ اٹھ رہی تھی۔ مدن کی نائٹی پگھل رہی تھی۔ سندر بیئر پیتا رہا اور وہ اسکی آغوش میں بکھرتی رہی۔ کاش کوئی

وقت کی لگامیں پکڑ کے روک دیتا ۔

یہ لمحے یونہیں فضا میں معلق ہو جاتے ۔ وہ اسی طرح سندر میں تحلیل ہو جاتی ۔ دوئی کا سوال مٹ جاتا ۔ وہ پیتے رہے سوتے رہے پھر جاگ اٹھے اور پھر سو گئے ۔

شام کو دونوں ننھے بچوں کی طرح ٹب میں چہلیں کرتے رہے ۔ باھر کی دنیا ان کے لئے ختم ہو چکی تھی ۔ گیلے بدن آتش دان کے پاس دو زانو ہوکر انھوں نے اپنا دنیا پا لی تھی ۔

دن بھر کی بیئر کا نشہ پھیکا پڑنے سے پہلے وھسکی کا رنگ چڑھنے لگا ۔ مدن کسی نہ کسی بہانے سے سندر کو لگائے رکھنا چاھتی تھی ۔ اگر اسکا بس چلتا تو وہ اسکی ممی بنا کر تکیہ پر سلا دیتی اور پھر اسکے منہ پر منہ رکھ کر ابدی نیند سو جاتی ۔ بس نہ تھا جو اسے ساری دنیا سے چھین کر اپنے دل کے کسی کونے میں قید کردے اور ایسا زبردست تالہ ڈالے کے سر پٹکے سے نہ کھلے ۔

مگر بیئر نہ وھسکی سندر کے جاتے قدم ڈگمگا نہ سکے ۔ مدن پر بھوت سوار ہو گیا ۔ سندر نے حسب معمول اسکی ٹھکائی شروع کی ۔ اتنی زور سے اسکی پسلی میں لات ماری کہ آنکھیں نکل پڑیں ۔ گھبرا کر اسنے پھر اسے بانھوں میں سمیٹ لیا ۔ بس یہی ادا تو مدن کے من بھا گئی تھی ۔ اسے یوں بکھیرنے اور سمیٹنے ھی میں لطف آنے لگا تھا ۔ اس چار چوٹ کی مار ھی میں لذت ملنے لگی تھی ۔ مدن تو چاھتی ھی تھی کہ وہ اسے اتنا مارے اتنا مارے کہ ھڈیاں چکنا چور ہو جائیں تب تو وہ اسے چھوڑ کر نہ جا سکے گا ۔

مگر خاندان والوں کی دھشت مدن کے پیار سے زیادہ مہیب ثابت ہوئی ۔ اور وہ چلا گیا اور مدن صبح تک آھیں بھرتی رھی تڑپتی رھی ۔

کاش وہ لنگڑا لولا اور اپاھج ہوتا ۔ اسکے سب جاننے والے اسے بھول جاتے اور وہ صرف اس کا ہو کر رہ جاتا ۔ بمبئی میں سندر کو ایک مرتبہ بخار آیا تھا ۔ دنیا کو لات مار کے وہ اسکی پٹی سے لگ کر بیٹھ رھی ۔ نہ اسکے گھر خبر کی نا ملنے جلنے والوں کو آنے دیا بیٹھی مسلسل اسکے جلتے ہوئے ہونٹ چومتی رھی ۔ پھر بھی چین نہ پڑا تو بخار میں جھلستے ہوئے جسم سے لگ کر

سو رہی - خواب میں اسنے دیکھا گرم گرم سنہری آنچ میں وہ پگھلتی جا رہی ہے - اور وہ سندر کے جسم پر خول بنکر منڈھ گئی ہے - اسکے رشتہ دار کسی جتن سے بھی مدن کا پلستر نہ کھرچ سکیں گے - ڈاکٹر نے اسے ڈرایا کہ اگر وہ گھنٹہ میں ہزار بار اسے ٹٹولے گی تو وہ اچھا نہ ہو سکے گا - خدا خدا کرکے رات بیتی اور دن ہوا - سندر کہہ گیا تھا - شاید وہ دیر سے آئے - لمحے پہاڑ ہو گئے دیوانی بلی کی طرح وہ ہوٹل میں چکر کاٹتی رہی - پھر تانگہ لیکر شہر کی خاک چھان ڈالی - دو جوڑے لائی تھی جو چیکٹ ہو گئے تھے - اسکی اجاڑ صورت پر کسی کو فلمسٹار ہونے کا گمان بھی نہ تھا - ایک سنیما ہال پر ٹھٹھ لگے ہوئے تھے - وہاں مدن کی ہٹ فلم چل رہی تھی - اسکا جی چاہا تانگہ پر کھڑی ہو کر دوپٹہ ہوا میں لہرا کر چلا چلا کر وہی گیت گانے لگے جسے لوگ سننے کے لئے دس دس مرتبہ جاتے تھے - مگر اسنے ٹالدیا - گانے کی آواز تو لتا کی تھی - اسکی اپنی آواز تو رات بھر کی جگار سے پھٹا بانس ہو رہی تھی -

کروڑوں کے دل کی ملکہ خوابوں کی رانی کے بھرے شہر میں سنسان دل لئے تنہا وحشیوں کی طرح جب چکر کاٹتے کاٹتے پیر شل ہو گئے تو وہ کوئے جاناں کی طرف چلدی - مگر وہاں جا کر معلوم ہوا سارا خاندان امرتسر گیا ہوا ہے - منگنی کی خبر سچ ہی نکلی -

سر جھاڑ جھنکاڑ وہ سیدھی سٹیشن سے میرے یہاں چڑھ دوڑیں نہ جانے کے دن سے نہ نہائی نہ دانت مانجھے - اتنی بدصورت فلمی حور میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی - میں نے مدن سے بہت کہا -

" نہا ڈالو - کچھ کھا لو - "

" ابتو تو اس سندر حرامزادے کی بھتی ہی کھاؤنگی - بتاؤ آپا کیا کروں - اس کمینے نے مجھے خراب کیا اور اب بیاہ رچا رہا ہے - "

" اب بنو مت تم پہلے ہی سے خراب تھیں - " میں نے جلکر کہدیا -

" آپا تم بھی اب کہ رہی ہو - تم تو بڑی روشن خیال ہو - "

جی چاھا اسی کے لہجہ میں کہہ دوں ۔

" روشن خیال کی دم ! " بھلا اس سے زیادہ روشن خیالی اور کیا کر سکتی ہوں کہ تمہاری اس نامراد زندگی کا الزام تمہاری محرومیوں اور امٹ تنہائی کے سر تھوپ دوں کیا میں تمہاری بیتی ہوئی زندگی کے قدم پلٹ کر نئی راہ پر ڈال سکتی ہوں ؟ کیا یہ زبردستی حلق میں آتارا ھوا زھر جو تمہاری رگوں میں جذب ہو گیا ھے نچوڑ کر نتھار سکتی ہوں کہ تم الگ اور زھر الگ ۔ نہیں یہ زھر تو اب گرفت سے باھر ھو چکا ھے ۔

" تم نہیں جانتیں آپا ۔ " اسنے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا ۔ اور میں نے سوچا بیشک میں نہیں جان سکتی ۔ تم جانتی ھو کہ وہ زندگی انسان کو کیا بنا دیتی ھے جہاں نہ ماں کا پیار نہ باپ کی شفقت، نہ بھائیوں کے پیار بھرے گھونسے نہ بہنوں کی میٹھی میٹھی چٹکیاں ۔ تم تھوھڑ کا پودا ھو، نہ پھل نہ پھول ۔

سندر سے ملنے کی ھر کوشش ناکام ثابت ھوئی ۔ جن فلموں میں وہ کام کر رھے تھے، وہ ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں بننے لگیں ۔

ایکدن وہ نا جانے کیسے سندر کے فلیٹ میں گھس گئی ۔ وہ پچھلے دروازے سے نکل بھاگا ۔ مارے غصہ کے مدن دیوانی ھو گئی ۔ اسنے پھاٹک پر اسے گریبان سے جا پکڑا ۔

" خون کردونگی حرامزادے ۔ " وہ غرائی ۔ بھیگی بلی بنا وہ اسکے ساتھ کمرے میں چلا آیا ۔

" کیا چاھتی ھو ۔ اسنے بجائے مارنے پیٹنے کے نرمی سے کہا ۔ کاش وہ مارتا پیٹتا تو یہ غیریت کی دیوار تو ٹوٹ جاتی ۔ وہ اسے مار کر سمیٹ تو لیتا ۔ مگر نہیں وہ مارنا بھی اپنی ھتک سمجھ رھا تھا ۔

" مجھے نوکر سمجھ کر رکھ لو ۔ تمہاری ماں کے پیر دھو کر پیوں گی سندر ۔ انہیں پلنگ پر بٹھا کر راج کراؤنگی ۔ تمہارے نوکر کتنا پیسہ چراتے ھیں میں تمہاری لونڈی بنکر رھونگی ۔ "

" مگر ۔ ۔ ۔ " وہ ھکسایا ۔ " سچی بات تو یہ ھے بھئی میں شادی کے چکر میں نہیں پڑنا چاھتا ۔ " مگر مدن سمجھ گئی ۔ اونچے گھر کا پوت ایک بیسوا سے بدتر عورت کو کیسے بیاہ سکتا

ہے۔ وہ خود ہزار عورتوں کے ساتھ رہ کر بھی کنوارا ہے۔ اس کنواری سے بھی زیادہ پاک اور مقدس جسکا کنوار پن کسی حادثہ کا شکار ہو گیا ہو۔

مرد سدا کنوارا ہی رہتا ہے۔ سونے کے کٹورے کی طرح جسمیں کوڑھی بھی پانی پی لے تو گندہ نہیں ہوتا اور مدن تو کچا سکورا تھی۔ جو سائے سے بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔

مدن کا خون کھول گیا سارے زخم تازہ ہو کر چھل گئے پہلے تو اسنے نہایت پھولدار قسم کی مغلظات سندر کے جنم جنم کو سنائیں پھر سارے گھر کی چیزیں توڑ ڈالیں تیل کی بوتل سے آئینہ کے پرخچے اڑائے الماری سے گلاس اور برتن نکال کر چھناچھن بجا دئے نئے سوٹ نکال کر بلیڈ سے دھجیاں اڑا دیں سوئیٹر مفلر موزے بنیان دانتوں سے کھسوٹ ڈالے سارے شیشے ٹینس کے ریکٹ سے پھوڑ ڈالے نئے قیمتی جوتوں کی قطار کی چاقو سے بوٹیاں اڑا دیں دیواروں سے فریم اتار کر جوتوں سے کوٹے پھر سندر کی میلی قمیص میں منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

سندر خاموش یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ جب مدن نے منہ سے میلی قمیص ہٹائی تو وہ جا چکا تھا۔

مدن نے پھر میرے گھر پر چڑھائی کی گھنٹوں بیٹھی مجھ سے سندر کو قتل کرنے کی ترکیبیں پوچھتی رہتی وہ اسے چٹ سے نہیں مارنا چاہتی تھی رنجھا کر مارنا چاہتی تھی کہ ساری عمر سسکے اسی کی طرح۔

"نامرد کردوں سور کے بچے کو۔"

"مجھے ایسی کوئی ترکیب نہیں معلوم" میں نے چڑ کر کہا۔

"اسکی آنکھوں میں تیزاب ڈالدوں۔ ساری عمر کو اندھا ہو جائے۔

مگر نہ سندر نامرد ہوا نہ اندھا۔ مہینہ بھر کے اندر وہ کومل سی بہو بیاہ لایا اچھوتی کنواری جسے فرشتوں نے بھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ مہینوں دلہن دولہا کی فلم انڈسٹری میں دعوتیں ہوتی رہیں۔

اگر صدمہ سے مدن خودکشی کرلیتی یا گھل گھل کر مرجاتی

تو میری کہانی کا کتنے سلیقہ کا خاتمہ ہوتا اور پھر میں لکھنے وقت ذلت نہ محسوس کرتی مگر وہ تو پیندے میں سیسہ لگے ہوئے کھلونے کی طرح لوٹ پوٹ کر کھڑی ہو گئی - ایسی ہی ایک دعوت میں وہ ایک پستہ قد نئے فلمی لڑکے کے ساتھ وہی اپنے ازلی کھردرے قہقہے لگا رہی تھی - وہ لطیفے چھوڑ رہا تھا مدن کو اچھو لگ رہے تھے اور منہ کے نوالے وہ پاس کھڑے ہونے والوں پر چھڑک رہی تھی - سندر بھی اسی میز پر اپنی شرمیلی دلہن کو خستہ سموسے کھلا رہا تھا -

مجھے دیکھتے ہی مدن میرے کان میں کھس پھسائیں -

" آپا کیا رائے ہے؟ شادی کرلوں ؟ "

" کس سے ؟ " میں نے اکتا کر پوچھا -

" درشن سے مرتا ہے حرامزادہ - کہتا ہے زہر کھالونگا تمہارے لئے - " نئی دلہن کی طرح شرمائیں -

" ضرور کرلو، نیک کام میں دیر کیسی ؟ "

اس بات کو کتنے سال گذر گئے - مگر اسوقت تک جبکہ میں یہ آخری سطریں لکھ رہی ہوں مدن کنواری ہے - اسکے سہرے کی کلیاں منہ بند ہیں - چمبور میں بنگلہ لینے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا - وہ خوبصورت سا بنگلہ جہاں مدن بیگم بیٹھی ہے - بچے چارونطرف سے گھیرے ہوئے ہیں -

" اماں کھانا دو، اماں کھانا دو - " اور وہ انہیں کفگیر سے مار رہی ہے - بچوں کا باپ مسکرا رہا ہے -

" مارتی کیوں ہو بیگم، بچے ہیں - "

قدرت اللہ شہاب

کے نئے

افسانوں

کا

نیا مجموعہ

سرخ فیتہ

مکتبہ شعور کی نئی پیشکش

غم جاناں



۱ — شاعر
۲ — افسانہ نگار
۳ — مصور

قدرت اللہ شہاب

شاعر — کیا لکھ رہے ہو ؟

افسانہ نگار — خاک ۔

شاعر — بڑا دلچسپ موضوع ہے ۔ میں بھی کوشش کر رہا ہوں کہ اس زمین میں کچھ فکر سخن کروں ۔

مصور — اپنا بھی یہی ارادہ ہے ۔ جب تک خاک کا تصور نہ کیا جائے ، طبیعت کسی رنگ پر جمنے ہی نہیں پاتی ۔

شاعر — آؤ مل کے خاک کی باتیں کریں ۔ یا خس وخاشاک کی باتیں کریں ۔ ۔ ۔

افسانہ نگار — تسلیمات ! صاحبو ، آپ دونوں گدھے ہیں ۔

شاعر — واللہ ! خوب یاد دلایا ۔ ابھی کل میں نے ''نوائے خر'' کے نام سے ایک شاندار نظم کہی ہے ۔ بند عرض کیا ہے ۔

مجھ سے پہلی سی مشقت مرے مزدور نہ مانگ !
اور بھی کام ہیں دنیا میں مشقت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں بوجھ کی راحت کے سوا

تو جو مل جائے اکیلا ، تو دولتی جھاڑوں
خاک میں تجھ کو لٹا کے تیرے کپڑے پھاڑوں
مجھ سے پہلی سی مشقت مرے مزدور نہ مانگ !

مصور — میرا اگلا شاہکار بھی اسی حسین و جمیل چوپائے پر ہوگا ۔ کیوب ازم کے نظریات کے مطابق جو فنی صلاحیتیں گدھے میں پائی جاتی ہیں ، وہ کسی دوسرے جاندار میں نہیں ہیں ۔

افسانہ نگار — میرا خیال ہے کہ گدھے کے بعد آپ حضرات بندر پر طبع آزمائی فرمائینگے ۔

مصور — بےشک ۔ سرریلنزم میں آرٹ کا کمال یہ ہے ، کہ ہر سبجکٹ کو اس کی مرکزی حقیقت کے قریب تریں لایا جائے ۔ حضرت انسان کی مرکزی اصلیت بندر کے نزدیک پہنچ کر بہت واضع ہو جاتی ہے ۔

شاعر — سرسوں کے ھرے کھیت میں اٹھلائے بندریا
بیلوں کو جتے دیکھ کے اترائے بندریا
مسکائے بندریا
شرمائے بندریا
بل کھائے بندریا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مصور — میں تو یہی رائے دونگا ، کہ اگر آپ اپنے فن کو زندہ رکھنا چاھتے ھیں ۔ تو اپنے افسانوں میں بندر کو اس کا مناسب منصب ضرور دیجئے ۔

افسانہ نگار — نہ صاحب مجھے بخشئے ۔ میں ابھی اللہ کی نعمتوں سے اس درجہ محروم نہیں ھوا ، کہ بندر کی طرف رجوع کروں ۔

مصور — خیر ، آپ کی مرضی ۔ صحیح رائے دینا میرا فرض تھا ۔ اگر آپ کو بندروں سے دلچسپی نہیں ، تو مینڈک اور مرغ بھی بڑے شاداب موضوع ھیں ۔

شاعر — مرغ پر اس خاکسار نے ایک مسدس کہا تھا ۔ ٹیپ کا بند ملاحظہ فرمائیے ۔

صبحدم خواب سے دنیا کو جگائیں تو ہم
نیند کے ماتوں کو تکبیر سنائیں تو ہم
تیرے گھر بار کی رونق کو بڑھائیں تو ہم
ترے دالان کو بیٹوں سے سجائیں تو ہم
پھر بھی اٹھتے ہی چھری ہم پر چلائی تونے
حیف یوں رسم وفا خوب نبھائی تونے

افسانہ نگار — صاحبو، یہ بندر، گدھے، مینڈک اور مرغ آپ کو مبارک ہوں۔ مجھے ان حسین و جمیل موضوعات سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

شاعر — غالباً آپ نے داستان طرازی کا مشغلہ ترک کر دیا ہے؟

افسانہ نگار — جی نہیں۔ میں خدا کے فضل سے اب تک افسانے لکھتا ہوں۔ اور خوب لکھتا ہوں۔

مصور — اگر آپ کو زندگی کے ان ٹھوس حقائق سے دلچسپی نہیں، تو شاید آپ الف لیلیٰ کے شہزادوں، جنوں کے بادشاہ اور کوہ‌قاف کی پریوں کی کہانیاں لکھنے کے شوقین ہونگے؟

افسانہ نگار — جی نہیں۔ خدا میری جمیلہ کو سلامت رکھے۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے جنوں کے بادشاہ یا کوہ قاف کی پریوں کا سہارا لینے کی مطلقاً حاجت نہیں۔

شاعر — ہائے کیا نام لے لیا ظالم نے!

مصور — زندگی کے خوابیدہ تار جھنجھوڑ ڈالے اس نام نے۔

شاعر — ہائے، کیا بات ہے جمیلہ کی۔ ایک زمانہ تھا، کہ اس کی رنگ برنگی چوڑیوں کی کھنک سے شعریت کے طوفان اُبلتے تھے۔

مصور — اس کے جسم کے اقلیدسی خطوط اور اس کی گھنیری بھوؤں کی سیاہ جھالریں میرے شاہکاروں کی معراج تھیں۔

شاعر — اس کی لانبی لانبی، کمر تک بل کھاتی ہوئی



زلفوں کا تصور
میری شاعری
کی جان تھا ۔
مصور ۔ میں نے اس کی
آنکھوں میں
کاجل کی تحریر
ابھارنے کی
خاطر اپنے فن
کو کمال تک
پہنچا دیا ۔
شاعر ۔ لیکن ہائے !
جب سے جمیلہ
نے اپنی زلف
دوتا کٹوا کر
بوبڈ ھیئر رکھ لئے ہیں ، میری شاعری مر گئی ۔

مصور ۔ اب وہ اپنی جھالردار بھویں استرے سے مونڈ کر ان کی جگہ سرمے کی تنی ہوئی لکیریں کھینچتی ہے ۔ میرے شاعر ، میرا فن برباد ہو گیا ۔

شاعر ۔ میرے پیارے افسانہ نویس ، تم اس لنڈمنڈ جمیلہ پر جتنی کہانیاں جی چاہے لکھتے رہو ۔ اب اس میں میرے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہی ۔

افسانہ نگار ۔ تم دونوں بڑے کورذوق عاشق ہو ۔ جس نکتے پر آکر تمہارا فن مر گیا ہے ، وہاں سے میرے آرٹ کی ابتدا ہوتی ہے ۔ اگر تم نے جمیلہ کی رعنائیوں کو ایک نظر دیکھنا ہے ، تو آؤ میرے ساتھ چلو میں تمہیں طلسم ہوشربا کے نظارے دکھاؤں گا ۔

شاعر ۔ کہاں چلو گے ؟

افسانہ نگار ۔ بوٹ کلب ۔

مصور ۔ قی ! مجھے وہاں جا کر ابکائیاں آتی ہیں ۔

میں نے کئی مہینے وہاں کی خاک چھانی ہے۔ اور جب کبھی میں وہاں جاتا ہوں، تو میرا جی چاہتا ہے کہ قصاب کی دکان پر لٹکی ہوئی گوشت کی ننگی رانوں کی تصویر کشی کروں۔

افسانہ نگار ــ اگر تمہیں کچے گوشت سے اسقدر نفرت ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں میٹروپول کی رقص گاہ میں لے چلونگا۔ وہاں جمیلہ کے لچکیلے بدن کو رنگین غباروں کی طرح رقصاں دیکھ کر تمہارا دل شاد اور روح منور ہو جائیگی۔

شاعر ــ میرے دوست! خدا کے لئے مجھے وہاں کی یاد نہ دلاؤ۔ وجدان کی تلاش میں وہاں کئی کئی راتیں جاگا ہوں۔ لیکن ہر بار وہاں جا کر میری شاعری کا جوہر خاک ہو جاتا ہے جب میں جمیلہ کو ہنسی خوشی ہر دوست اور دشمن کے ساتھ باری باری دوش بدوش، بازو بہ بازو، سینہ بہ سینہ رقص کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، تو میری شاعری میں رقیب روسیاہ کا لطیف تخیل فنا ہو جاتا ہے۔

مصور ــ اب وہ میرے سٹوڈیو میں ماڈل بننے بھی نہیں آتی۔ بلکہ فوٹو گرافروں کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے۔ تا کہ اس کی تصویریں اخباروں کے پہلے صفحات پر شائع ہوں۔

شاعر ــ اس کے فلیٹ میں بجلی کی گھنٹی لگی ہوئی ہے۔ اور مجھے بھی دربان کی جھڑکیاں سہنے اور اس کی منت سماجت کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوتا۔

مصور ــ میرے نزدیک جمیلہ کا وجود نیست و نابود ہو چکا ہے۔ اب میں اس کی یاد میں اپنے آرٹ کو نئی شاہراہوں پر چلا رہا ہوں۔ جب مجھے جمیلہ کی خوبصورت اور سڈول

ٹانگوں کا خیال آتا ہے، تو میں رنگوں کی آمیزش سے چونے اور سیمنٹ کے مضبوط ستون بناتا ہوں۔ جب مجھے اس کے حسین چہرے کی یاد ستاتی ہے، تو میں ایکس رے کے فوٹو کی طرح ہڈیوں کے ڈھانچوں کی تخلیق کرتا ہوں۔۔۔

افسانہ نگار ۔ صاحبو، مجھے آپ دونوں کی حالت پر رحم آتا ہے۔ میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں جمیلہ کی ایک بالکل نئی اور اچھوتی جھلک دکھاؤں گا۔

شاعر ۔ میں خوب جانتا ہوں، کہ اب تم ہمیں کسی ریفیوجی کالونی چلنے کی دعوت دو گے!

مصور ۔ میں وہاں ہرگز نہیں جاؤنگا۔ میرے ڈبوں کے سارے رنگ ختم ہو گئے ہیں، لیکن ہندوستان سے آنے والے ریفیوجیوں کی تعداد میں کمی نہیں ہونے پاتی۔ میرا آرٹ اس رفتار کا ساتھ دینے سے بالکل قاصر ہے۔ میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔

شاعر ۔ میں نے بھی اس کوچے کی بہت ہیرا پھیری کی ہے، اور کئی بار اسی تاک جھانک میں پٹا بھی ہوں۔ نا صاحب، اب وہاں جانے سے میری توبہ ہی بھلی۔

افسانہ نگار ۔ تم بڑے بزدل انسان ہو۔ میری طرف دیکھو۔ کتنی بار میں نے خود جوتے کھائے ہیں، لیکن میں ابھی تک ریفیوجیوں پر افسانے لکھنے سے باز نہیں آیا۔

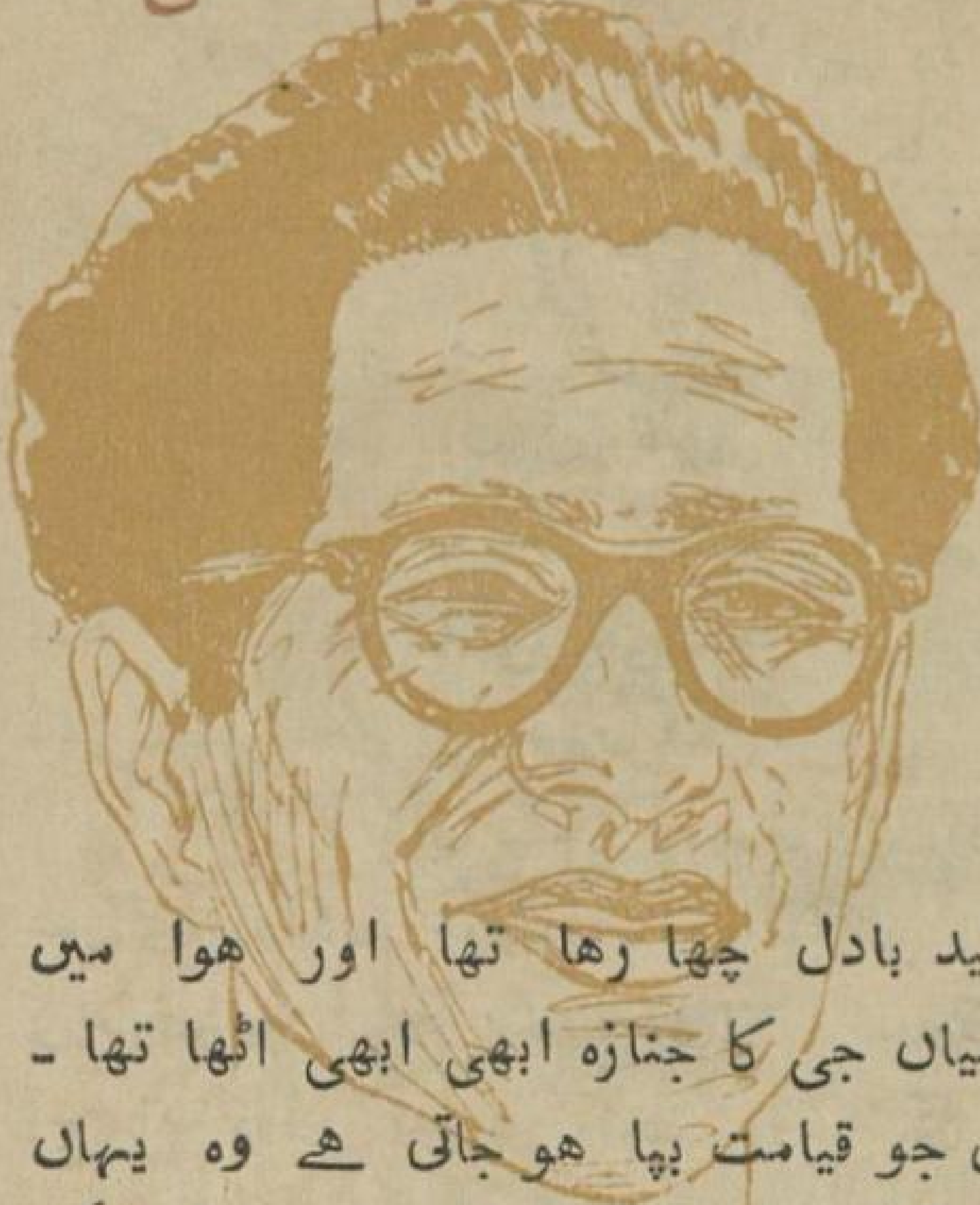
شاعر ۔ تمہارا کیا ہے۔ تم تو بےحیا ہو۔ ہر روز جوتے کھاتے ہو اور پھر کپڑے جھاڑ کر افسانہ لکھنے بیٹھ جاتے ہو۔ لیکن شاعر کا دل بڑا نازک ہوتا ہے، میرے یار۔ ذراسی ٹیس لگنے سے یہ آبگینہ ٹوٹ جاتا ہے۔ تم شوق سے جا کر جوتے کھاؤ، اور افسانے لکھو۔ میں یہاں بیٹھ کر "اونٹ گاڑی"

پر اپنی نظم مکمل کرونگا - اور میرا دوست
مصور لنگور کی لہراتی ہوئی بانکی ذلف دوتا ــــ
توبہ معاف کیجئے گا ، لنگور کی لہراتی ہوئی
بانکی دم کی نقاشی کریگا - آ ھا ھا، سبحان اللہ
کیا غضب کے شعر ھیں - عرض کیا ھے :

اونٹ پھر آیا دل زار ! نہیں اونٹ نہیں !
یہ تو گاڑی ھے کہیں اور چلی جائیگی -
ڈھل چکی رات ، بکھرنے لگا پاؤڈر کا غبار
پھڑپھڑانے لگے شانوں پہ ترا شیدہ بال

- - - - - - - - - - - -
- - - - - - - - - - - -

احمد ندیم قاسمی



ماتم

آسمان پر کفن کا سا سفید بادل چھا رہا تھا اور ہوا میں کافور کی بو بسی ہوئی تھی ۔ میاں جی کا جنازہ ابھی ابھی اٹھا تھا ۔ مگر جنازہ آٹھنے پر گھروں میں جو قیامت بپا ہو جاتی ہے وہ یہاں غائب تھی ۔ کھلے آنگن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عورتیں ایک دوسرے میں کچھ یوں پیوست ہو کر بیٹھی تھیں جیسے اگر ایک آٹھے گی تو سب آٹھتی چلی جائیں گی ۔ مگر وہ خاموش اور حیران بیٹھی تھیں ۔ بچوں تک نے دم سادھ لیا تھا ۔ اور منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا جیسے لاؤڈسپیکر پر کائیں کائیں کر رہا تھا ۔

" تیر تیر تیر " ۔ یکایک ایک عورت کوے کی طرف اپنا پورا بازو اٹھا کر پکاری ۔ کوا اڑ گیا اور وہ مجمعے سے مخاطب ہو کر بولی ۔ " ماتم کے گھروں میں بھی ہڈیاں ڈھونڈنے آ نکلتے ہیں کلموہے زمانے بھر کے " ۔ پھر وہ ایک لمبی " ہا " کے ساتھ اپنی جگہ پر سمٹ گئی ۔

مجمعے کو شاید اسی بات کا انتظار تھا کہ کوئی بولے تو ہم بھی بولیں ۔ اس لئے سب بولنے لگیں ۔ اور سب نے جیسے ایک ساتھ پہلو بدلے ۔ " ہا بےچاری بی بی " کسی نے کہا ۔

" ہا " سب نے کورس میں ایک لمبی آہ بھری ۔

آنگن کے پرلے گوشے سے ایک بڑھیا نے پوچھا ۔ " بی بی روئی کہ نہیں ؟ "

" نہیں " کمرے کے دروازے کے پاس سے جواب آیا۔ " ویسے ھی ٹکر ٹکر دیکھے جا رھی ھے "

وھی بڑھیا پکاری۔ " اسے رلانے کی کوئی تدبیر کرو ورنہ اس کا کلیجہ یوں جھرر سے پھٹ جائے گا۔ یہ سکتے کی بیماری ھے۔ پتہ بھی نہیں چلتا اور جان ھوا ھو جاتی ھے نوراں اپنے بیٹے کے مرنے پر یونہی مر گئی تھی "

سب عورتوں کی نظریں بی‌بی پر جم گئیں جو اپنے میاں کے مرنے کے بعد اب تک ایک آنسو بھی نہیں گرا پائی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھ بھی لیتی تھی۔ باتوں کا بھی مختصر سا جواب دے دیتی تھی مگر روتی نہیں تھی۔

" رو بی‌بی۔ جی کھول کے رو۔ " پرلی طرف سے ادھیڑ عمر کی بھاگاں عورتوں کو الانگتی اور بین کرتی ھوئی دروازے کی طرف یوں بڑھی جیسے بی‌بی کو رلا کر ھی دم لے گی۔ " تو آج نہ روئی تو پھر کب روئے گی۔ تیرے دنوں پر اب کوئی سورج نہیں چمکے گا بی‌بی بہن۔ اتنے لمبے اندھیرے میں تو ایک بھی چیخ نہیں مارتی۔ میاں جی مر گئے تو تو بھی مر گئی۔ میاں جی کی موت پر نہیں روتی تو اپنی موت پر تو رو لے "

" میں مر جو گئی ھوں بھاگاں۔ " بی‌بی نے آھستہ سے کہا اور یہاں سے وھاں تک عورتیں یوں کڑک کر رو دیں کہ ان کی گودوں کے بچے بھی تڑپ کر جاگ اٹھے اور بلک بلک کر رونے لگے۔ جن کے کانوں میں بی‌بی کی آواز نہ پہنچ سکی وہ اپنے آس پاس سے رونے کی وجہ پوچھ کر رو دیں۔ حتیٰ کہ ماتمی لہر آنگن کے پرلے سرے تک پھیل گئی۔ جو بچے جنازے کے پیچھے نکل گئے تھے، ماتم کی یہ گونج سن کر بھاگتے ھوئے آئے اور آنگن میں جھانکنے لگے۔ جو بچے سناٹے سے سہم کر ماؤں کے پاس ٹھنسے بیٹھے تھے، اٹھے اور کمرے کے دروازے سے لگ کر بی‌بی کو گھورنے لگے۔

بی‌بی کا چہرہ فق تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا خالی پن تھا جیسے کوئی ان میں سے کچھ نکال کر لے گیا ھو۔ اس کے ھونٹ مٹی ھو رھے تھے اور اس کی کلائی کے ایک زخم پر ایک مکھی بار بار آکر بیٹھ جاتی تھی۔ جب مولوی صاحب

نے یکایک بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھ کر میاں جی کے دم توڑنے کا اعلان کیا تھا تو مکان کی دھلیز پر بیٹھی ہوئی بی بی نے اپنی چوڑیاں اپنے ہی ہاتھوں سے توڑ ڈالی تھیں۔ اور ادھر جب میاں جی کے ڈاٹھا باندھا جارہا تھا تو ادھر عورتیں سوئی کی مدد سے بی بی کی کلائی میں سے کانچ کا ایک ٹکڑا نکال رہی تھیں۔



بی بی کو پچاس برس کی عمر میں بھی چوڑیاں پہننے کا شوق تھا۔ میاں جی کو ساٹھ برس کی عمر میں بھی بی بی کی کلائیوں میں چوڑیاں دیکھنے کا شوق تھا۔ سفید کلائی پر ویسے بھی ہر رنگ کی چوڑی سج جاتی ہے مگر میاں جی تو چوڑیوں کے انتخاب کے معاملے میں فن کار تھے۔ ایسے ایسے رنگوں کی چوڑیاں ڈھونڈ کر لاتے تھے کہ آج تک نہ کسی نے دیکھے تھے نہ سنے تھے ایک بار تو انھوں نے بی بی سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جی چاہتا ہے تمہارے سارے جسم پر چوڑیاں چڑھا دوں۔ ایسی پھبتی ہیں جیسے چینی کی پلیٹ میں گلاب کے پھول پڑے ہوں۔

میاں جی کو قسم قسم کی پلیٹیں جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ اسی لئے گول، چوکور، تکونی اور گوشے دار پلیٹوں کا ایک انبار ان کے ہاں جمع ہوگیا تھا۔ اور وہ پلیٹ تو انہیں بہت عزیز تھی جو وہ پونا سے لائے تھے۔ ان دنوں وہ فوج میں جمعدار

کلرک تھے ۔ کوئی چینی پھیری والا پلیٹیں بیچتا پھرتا تھا ۔ اس پلیٹ کے وسط میں ایک چینی لڑکی کی تصویر تھی جو انگور کی بیلوں کے حاشیے میں کھڑی ننھی سی پنکھیا کی اوٹ میں مسکرا رہی تھی ۔ میاں جی کہتے تھے کہ جب اُنھوں نے یہ تصویر دیکھی تو اُن کی نظروں کے سامنے بی‌بی کی صورت گھوم گئی تھی ۔ سو انھوں نے چینی کو منہ مانگے دام دے کر یہ پلیٹ خرید لی تھی اور جب چھٹی پر آئے تھے تو یہ پلیٹ نکال کر بی‌بی، سے کہا تھا ۔ ”جس طرح کہانیوں کے جنوں بھوتوں کی جان طوطوں میں ہوتی ہے اسی طرح تمھارے اس جن کی جان اس پلیٹ میں ہے اس لئے کہ پلیٹ میں تم ہو۔“

بی‌بی نے یہ پلیٹ برسوں تک اپنے کلیجے سے لگا کر رکھی تھی ۔ دم توڑنے سے پہلے میاں جی نے فرمائش کی تھی کہ انھیں دواءالمسک اسی پلیٹ میں رکھ کر کھلائی جائے ۔ اب بھی وہ پلیٹ کمرے کے اندر ایک الماری پر رکھی تھی اور بی‌بی بار بار اس کی طرف یوں دیکھ لیتی تھی جیسے ابھی بچوں کی طرح ٹھسک ٹھسک کر رونے لگے گی ۔ مگر نہ جانے یکایک اسے رونا بھول گیا تھا ۔

رونا تو اس کا ایک ہتھیار تھا ۔ وہ تو میاں جی کی ایسی باتوں پر بھی رو دی تھی کہ آج کے سالن میں کل والا مزا نہیں ہے ۔ اور اسے روتا دیکھ کر میاں جی کو صدق دل سے اعتراف کرنا پڑا تھا کہ مغلوں کے شاہی باورچیوں کو بھی اس مزے کا سالن پکانے کا نسخہ معلوم نہ تھا ۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے وہ دونوں کبھی کبھی خود ہی بچے بن جاتے تھے ۔ خوب خوب روٹھتے اور روتے تھے ۔ ”تم مجھ سے ویسا پیار نہیں کرتیں جیسا میں تم سے کرتا ہوں ۔“ میاں جی کہتے اور بی‌بی اپنی کنپٹیوں کی سفیدی کے باوجود مچل جاتی کہ میاں جی نے اس کے ایمان پر حملہ کیا ہے ۔ اور آج میاں جی اس کے گھر میں سے ہمیشہ کے لئے اٹھ گئے تھے ۔ اب وہ شام کی نماز پڑھ کر واپس آنے والے میاں جی کے قدموں کی چاپ کبھی نہیں سن سکے گی ۔ اب کبھی یوں نہیں ہوگا کہ آدھی رات کو بی‌بی کی آنکھ کھلے تو اس کا سر میاں جی کے زانو پر رکھا ہو اور میاں جی اس کے ہونٹوں کے خطوط پر اپنی

ایک انگلی کی پور پھیر رہے ہوں ۔ اب کچھ بھی تو نہیں ہوگا ۔ کچھ بھی تو نہیں ہوگا ۔ بی‌بی یہ سب کچھ سوچ رہی تھی مگر اسے ان سوچوں پر بھی تو رونا نہیں آرہا تھا ۔

اگر اس کے آنسوؤں کا سوتا یکایک خشک ہوگیا تھا تو جب بھی کم سے کم دنیاداری کے لئے تو اس کا رونا ضروری تھا ۔ میاں جی کی دور و نزدیک کی رشتہ دار میں بھاں بھاں روتی ہوئی آتیں اور بی‌بی کو گلے سے لگا کر ایسے ایسے بین کرتیں کہ شہر والے سنیں تو حیرت زدہ رہ جائیں کہ کیا یہ عورتیں بھی اس حد تک سوچ سکتی ھیں ۔ مگر جب وہ بی بی سے الگ ھوتیں اور اس کی آنکھوں میں دھول اڑتی دیکھتیں تو بعض حیران ھو جاتیں ۔ بعض نفرت سے منہ پھیر لیتیں اور بعض چپکے سے دوسری کے کان میں کہتیں ” دنیا میں یہ پہلی بیوی ھے جو اپنے میاں کی موت پر خوش ہوئی ھے ۔“ یہ سرگوشی ایک کان سے دوسرے کان میں منتقل ھوکر چاروں طرف پھیل جاتی اور یہاں سے وھاں تک عورتیں رونے کے بجائے ٹھوڑیوں اور ناکوں پر انگلیاں رکھ کھسر پھسر کرنے لگتیں ۔

سب عورتیں بی‌بی سے کھچی کھچی سی بیٹھی تھیں ۔ بچے بھی بی‌بی سے مایوس ھوکر اندر کمرے میں کھیلنے لگے تھے اور بی بی اس بھرے آنگن میں اکیلی رہ گئی تھی ۔

رونا کوشش سے نہیں آتا ۔ یہ تو محبت کی طرح بڑی بے ساختہ چیز ھے ۔ مگر بی‌بی رونے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی ۔ اس نے پچھلے تیس برسوں کا ایک ایک واقعہ یاد کر ڈالا ۔ کئی بار اس نے محسوس کیا کہ برسات کی رات ھے ۔ چھت پر بوندیں بج رھی ھیں کمرے میں میلی میلی روشنی والا دیا جل رھا ھے ۔ میاں جی کا سر اس کے بالوں میں ڈوب گیا ھے اور اس کے ھونٹ میاں جی کے سینے کے بال چھو رہے ھیں ۔ ان یادوں سے اسے جھرجھری ضرور آگئی مگر آنکھوں میں اسی طرح ریت کھٹکتی رھی ۔ کئی بار بی‌بی نے اس جگہ کو گھورا جہاں میاں جی کی میت صبح سے جنازہ اٹھنے تک رکھی رھی تھی ۔ وہ ان پر پچھاڑیں کھا کھا کر گری تھی مگر لوگ پچھاڑوں کو نہیں دیکھتے ۔ آنسوؤں کو دیکھتے ھیں ۔ ایسے موقعوں پر تو بعض حیوان بھی پچھ ڑیں کھا کر

گر جاتے ہیں۔ انسان کی پہچان تو رونا ہے۔ انسان روئے نہیں تو کوئی کیسے مانے کہ اس کا دل دکھا۔ اور انسان کا دل نہ دکھے تو اسے رونا کیسے آئے۔

صحن کے ایک ایک چپے سے بی بی کی زندگی کے کتنے واقعے چمٹے ہوئے تھے۔ ان دیواروں اور ان منڈیروں پر آج کتنی ڈھیر سی کہانیاں اتر آئی تھیں۔ بی بی نے رونے کی خاطر ایک ایک چیز کو گھورا۔ اس کی نظریں منڈیروں، دیواروں اور دروازے پر سے گھومتی ہوئی کمرے کے اندر داخل ہو گئیں۔

یکایک وہ تڑپ کر اٹھی۔ دروازے کی طرف ایک قدم اٹھایا اور پھر ایک بلند چیخ کے ساتھ سینے پر زور کا ایک دوھتڑ مار کر وہیں ڈھیر ہو گئی۔

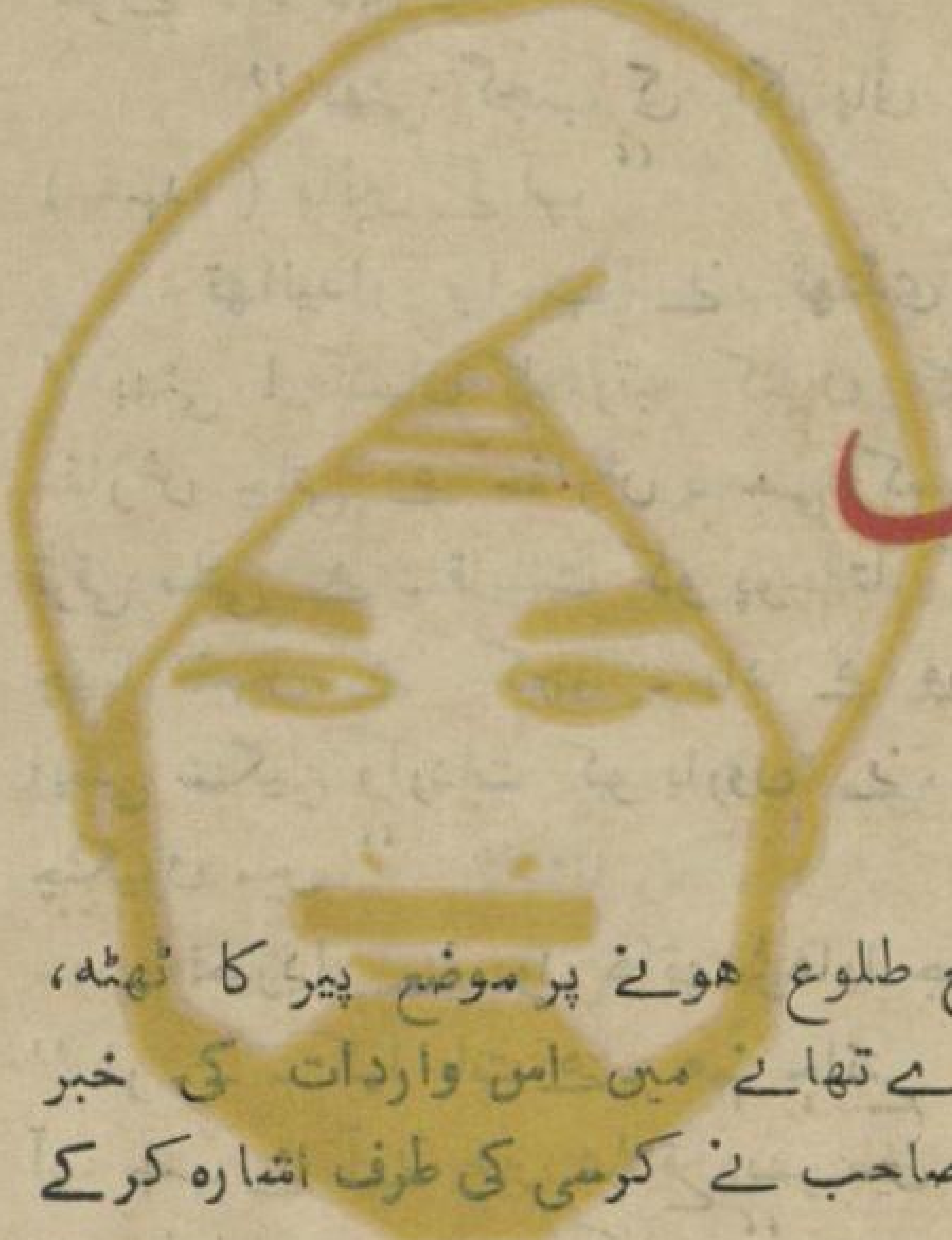
بھاگاں اٹھ کر اس کی طرف لپکی۔ پھر آنگن کے پرلے سرے تک تمام عورتیں اٹھتی چلی گئیں۔

"کیا ہوا؟" کسی نے پوچھا۔

"بی بی رو رہی ہے۔" کسی نے جواب دیا۔

"صبر کا بند ٹوٹ گیا نا آخر" بھاگاں نے بلکتی اور سسکتی ہوئی بی بی کے بھیگے ہوئے چہرے کو اپنے پلو سے پونچھ کر کہا۔ سب عورتیں ایک ساتھ بیٹھ گئیں۔

اندر کمرے میں کسی عورت نے ایک بچے کے زور کا چانٹا مارا پھر وہ بچے کو بازو سے گھسیٹتی ہوئی دروازے پر آکر پکاری۔ "نامراد نے بی بی کی چینی پلیٹ کے ٹکڑے کر دئے ہیں۔"



تفتیش

بلونت سنگھ

ڈاکے کے دوسرے روز سورج طلوع ہونے پر موضع پیر کا ٹھٹہ، کا نمبردار گاؤں سے چھ کوس پرے تھانے میں اس واردات کی خبر دینے کے لئے پہونچا تو تھانیدار صاحب نے کرسی کی طرف اشارہ کرکے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

نمبردار رنگین تہبند باندھے کرتا پہنے ٹیڑھا میڑھا صافہ سر پر لپیٹے بارعب انسان دکھائی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوں تو تھانے میں ان گنت طرہ باز آیا کرتے تھے لیکن وہاں رعب اسی کا مانا جاتا تھا جسے بیٹھنے کو کرسی ملے۔ چنانچہ کرسی پر بیٹھتے ہی نمبردار نے گردن اکڑا، سر پیچھے کو پھینک کر پروقار انداز سے چند دیہاتیوں کی جانب دیکھا جو زمین پر بیٹھے تھے یا تھانیدار جی کے روبرو ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

دو چار کی مرمت کرنے کے بعد تھانیدار صاحب نمبردار کی جانب متوجہ ہوئے۔

"ہاں بھئی کہو کیا حال ہے"

"آلا کا پھجل ہے جے (بھئی جی)"

"نمبردارا! اللہ کا فضل ہوتا تو تم تھانے میں دکھائی نہ دیتے۔"

یہ کہہ کر تھانیدار صاحب پرمعنی انداز میں مسکرائے اور اپنی دور رسی پر خود ہی خوش ہو کر انہوں نے حقے کی نے نمبردار کی طرف بڑھانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔

نمبردار کی مونچھیں پھڑکیں اس نے نے دانتوں میں دباتے ہوئے داد دی۔

" بھئی گجب کی اکل پائی ہے آپ نے ولا ! بڑا اوہدہ (عہدہ) پائیں گے آپ "

تھانیدار صاحب نے ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے کہا " بھئی ! کہاں کا رتبہ کہاں کا عہدہ۔ انگریز کے راج میں سفارش چلتی ہے سفارش۔ جس کسی کی ' پہونچ ' ہو اسی کو ترقی ملتی ہے۔ قابلیت کو پوچھتا کون ہے ؟ نمبردار ! تم سے چھپا نہیں ہے کچھ۔ یاد ہے وہ ' جھموکے ' والا معاملہ۔ ایسی سنگین واردات کو یاروں نے چٹکیوں میں حل کر ڈالا تھا، چٹکیوں میں "

نمبردار نے یوں ہاتھ بڑھایا جیسے شعر کی داد دے رہا ہو۔ " ار۔۔۔ کیا بات ہے۔ ہم جانتے ہیں صاب ہم جانتے ہیں۔ آپ جب سے آئے ہیں علاقے بھر میں دھاک بیٹھ گئی ہے کیا مجال جو چڑیا بھی پر مار سکے۔ "

تھانیدار صاحب بڑی خندہ پیشانی سے کچھ دیر تک اس داد سے محظوظ ہوتے رہے۔ پھر بولے :

" اچھا تو اب اصل بات پر آجاؤ۔ بڑا کام پڑا ہے کرنے کو۔ ہاں تو کیا بات ہے ؟ "

" بات تو تھانے دار جے (جی) ایسی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو "

" گھبراؤ مت کہہ ڈالو۔ تم جانتے ہی ہو۔ ہمارا تو دن رات کا کام ہی یہی ہے۔ "

" کل شام گاؤں میں ڈاکے کی باردات ہو گئی ہے "

" شام ہی کو ؟ "

" جے ہاں شام ہی سمجھئے "

" کمال ہے "

" آپ جانتے ہی ہیں کل شام بڑے جور کی آندھی چلی تھی۔ گرد باد کا یہ حال کہ جمین سے آسمان تک دھواں دھار ہو گیا۔ نہ جانے ڈاکوؤں نے کب سے موقعہ تاڑ رکھا تھا ابھی لوگ سونے بھی نہیں پائے تھے کہ ایک دم تین گولیاں چلنے کی آواج آئی۔

بہت سے لوگ تو ڈر کے مارے بستروں میں دبک گئے لیکن کچھ ایسے من چلے بھی تھے جو لاٹھیاں ، چھویاں ، اور ٹکوے لے کر میدان میں نکل آئے ۔"

" اچھا گولی بھی چلی تھی "

" جے ہاں ۔ گاؤں میں تو ایک بندوق تھی رام لال مانھے والی سووں تو تھانے میں بند پڑی ہے ۔ اس لئے میں سمجھ گیا کہ یہ پھیر (فائر) ڈاکوؤں نے ہی کئے ہیں "

" اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکے کے ساتھ قتل بھی ۔ ۔ ۔ "

" جے نہیں مرا کوئی نہیں "

" کیسے ہو سکتا ہے جی ۔ ایک نہیں تین گولیاں چلیں اور موت ایک بھی نہ ہو ۔ نا ممکن ، بالکل ناممکن ۔ ۔ ۔ "

" یہ بھید تو ہم پر بھی نہیں کھلا لیکن سچی بات ہے کہ موت کسی کی نہیں ہوئی "

" چلو اچھا ہے قتل ہو جاتا تو جھنجھٹ اور بڑھتا ۔ ہاں تو ڈاکو مال لوٹنے میں کامیاب ہوئے یا نہیں "

" بوھت کامیاب رہے جے "

" کون سے گھر پر ھاتھ صاف کیا انھوں نے "

" پیارا سنگھ کے گھر پر اور مانھے بگیرہ کے گھروں پر بھی ۔ ۔ ۔ "

" اچھا ؟ "

" ھاں جے "

" حد ہو گئی "

" ھاں جے حد تو ہو ہی گئی "

" اور یہ سب کچھ شام کے وقت پیش آیا ۔ تم لوگ کیا افیون کھا کر سوتے ہو ؟ "

" سوئے کہاں جے ۔ سبھی تو جاگ رہے تھے "

" یہ اور بھی بری بات ہے ۔ کیا اتنے ڈاکوؤں کے گاؤں میں داخل ہونے کی کسی کو پھر خبر نہیں ہوئی ۔ بھئی حد ہو گئی ۔ کمال ہے "

" حد ہو گئی کمال ہے پر جے سوال تو یہ ہے کہ آندھی کے شور میں کان پڑی آواج سنائی نہیں دیتی تھی ۔ اور گھپ اندھیرا ۔

گلیوں میں آدمی نہ آدمی کی جات - چوروں کا پتہ بھی چلتا تو کیسے - - - "

" بہت زیادہ مال لے آڑے کیا ؟ "

" ھاں جی - اجی وہ تو شائت سارا گاؤں لوٹتے کیوں کہ شام ہوتے ھی انھوں نے اپنی کاربائی شرو کردی تھی - وہ تو کہیئے اللہ کی سیدھی نجر تھی ورنہ نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا - - - آکھر جب انھوں نے اپنا کام کرھی لیا تو نہ جانے گولیاں کیوں چلائیں یا شائد یونہی ھوا میں پھیر کر دیئے ھوں - لوگوں کو ڈرانے کے لئے - پر یہ بات بھی سونچنے کی ھے کہ ھوا میں پھیر کر کے انھوں نے گاؤں والوں کو ھشیار کر دیا - انھیں ایسا تو نہیں کرنا چاھئے تھا - کیوں جی آپ کا کیا کھیال ھے ! "

" ھو سکتا ھے یونہی شان دکھانے کو فائر کیا ھو - انھوں نے سمجھا ھو کہ ذرا گاؤں والوں پر رعب جم جائے گا - ایسے وقت میں کسی کا انھیں ڈر تو تھا نہیں - پر خیر چھوڑو اس بات کو ، آگے بڑھو - "

" یہ باریکیاں تو آپ جانیں صاب - پر جی مزا بھی کوئی نہیں "

" یہ بھید بعد میں کھلے گا - جب کسی کی موت ھی ھوتی تو پھر گولی چلنے پر اتنی گہری سوچ بچار کی بھی کیا ضرورت ھے "

" ھاں جی کوئی بھید بھلا آپ سے کیوں کر چھپارہ سکتا ھے "

" اچھا تو ان کے پاؤں کے نشان کا کوئی سراغ ملا یا نہیں ؟ "

" نہ جی بالکل نہیں "

" کچھ بھی نہیں ؟ "

" آندھی جو چل رھی تھی منوں گرد اڑ رھی تھی ان لوگوں کے چلے جانے کے دو گھنٹہ تک آندھی کا بڑا جور رھا - اتنی گرد آڑی اتنی گرد آڑی کہ بس توبہ ھی بھلی - گلیوں ، کھیتوں ، پگڈنڈیوں اور میدانوں پر گرد کی تہیں جم گئیں - ھر شے کا نشان مٹ گیا - اور پھر رھی سہی کسر موسلا دھار بارش نے پوری کردی "

تھانے دار صاحب نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا " بھئی !

بڑا پیچیدہ کیس معلوم ہوتا ہے ۔ عجیب بات ہے آج کل اللہ بھی ڈاکوؤں کا ساتھ دیتا ہے ،،

،، کلجگ ہے نا تھانیدار جے ۔ ایک رتی برابر سراغ نہیں ملا ۔ ایک کھوجی کو بلایا تو اس نے بھی گول مول ٹال مٹول کردی ۔ بچارے کو پتہ بھی چلتا تو کیوں کر ؟ ،،



،، ارے بھائی ! پیارا سنگھ کا مکان بھی تو گاؤں کے بہت اندر جا کر ہے ۔ اچھا تو کیا سب سے پہلے آمی کے وہاں پہونچے وہ لوگ ؟ ،،

،، ھاں جے ،،

،، کدھر سے داخل ہوئے ہونگے مکان میں ؟ ،،

،، بالکل سامنے سے پچھواڑے سے تو وہ مکان اس قدر اونچا پڑتا ہے کہ اس پر چڑھنا ناممکن ہے جے ۔ اور پھر جب کہ وہ صحن کی نیچی دیوار پھاند کر آسانی سے اندر جا سکتے تھے تو بھلا انہیں پچھواڑے ٹکریں مارنے کی کیا جرورت تھی ؟ ،،

،، ھاں بات تو پتے کی کہتے ہو اور پھر رات بھی ، جیسا کہ تم کہہ رہے ہو ، بالکل تاریک تھی ،،

،، جے ،،

خیر ! سارا حال تو موقعہ پر ھی کھلے گا اچھا تو اس کے علاوہ کوئی بات معلوم نہیں ہوئی ؟ ،،

،، ارے پیارا سنگھ کا سالا کپورا سنگھ بھی تو ڈاکوؤں میں شامل تھا ،،

،، پیارا سنگھ کا سالا ؟ ،،

،، ھاں جے ،،

،، ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ ،،

،، ھاں جے وھی تو میں کہتا ہوں ۔ آخر کوئی کیسا

بھی کمینہ کیوں نہ ہو - سگی بہن کو لوٹنے کے لئے کوئی بھی آدمی تیار نہیں ہو سکتا ،،

" ارے نمبردار بھولی باتیں کرتے ہو - کس کی بہن کس کا باپ - سب چلتا ھے - جب آدمی بری صحبت میں پڑ جائے تو اسے کچھ سدھ بدھ نہیں رہتی - اپنے پرائے - برے بھلے کی تمیز اٹھ جاتی ھے - - - - - - اچھا تو یہ کیسے پتہ چلا کہ کپورا سنگھ ڈاکوؤں کے گروہ میں تھا - ،،

" ایک آدمی نے اپنے آنکھوں سے دیکھا ھے ،،

" وہ کیسے ؟ ،،

" گولیاں چلنے کے آواز سن کر لوگ جب باھر نکلے تو اس وقت چور گلی میں بھاگتے دکھائی دیئے اندھیرا ہونے کے کارن لوگ بچ بچ کر چل رہے تھے بھئی نہ جانے کتنے ڈاکو ہوں اور نہ جانے کون کون سے ھتھیار ان کے پاس ھوں اور وہ کھدا جانے کہاں چھپے بیٹھے ہوں - آندھی کا جور نہ ھوتا تو ان کا پیچھا کرنا اتنا مشکل نہ ھوتا - گلی میں تو ان سے مڈبھیڑ ہوئی اور گاؤں کے باھر پھونچ کر نہ جانے وہ کہاں گائب ہو گئے - - - ؟ ،،

" ارے واہ ! ڈاکو تھے کہ چھلاوے ایسی باتیں پہلے تو کبھی سننے میں نہیں آئیں - - - ،،

" اجے چھلاوے تو کیا تھے بس جرا آندھی نے کام کھراب کر دیا نہیں تو کھون کھرابہ ہو جاتا - ھمارے گاؤں کے جوان بھلا کسی سے کم تو نہیں - - - ،،

" اچھا تو مان گئے اب آگے بات کرو ،،

" جب لوگ گاؤں سے باھر نکلے تو دیکھا کہ مدھم سائے ادھر ادھر گھوم پھر رہے ھیں - گھوڑے ھنہنا رہے تھے اور ڈاچیاں بلبلا رھی تھیں - آندھی کے توپھان میں یہ ایک اور توپھان ، دکھائی دیا - گاؤں کے لوگوں کو مقابلے پر آتے دیکھ کر انھوں نے جان بوجھ کر لڑائی سے بچنے کی کوشش کی - - - ،،

" ارے وہ تو ھوا - - - لیکن میری بات تو ایک سرے ھی سے گول کر گئے میں پوچھتا ھوں کہ کپورا سنگھ کا پتہ کیسے چلا - ،،

" ہاں جی وہی تو بتانے جا رہا ہوں ۔ اُن میں سے ایک گھوڑسوار گاؤں کے کچھ ، آدمیوں کے نرگے میں آگیا ۔ ادھر جو بجلی چمکی تو ایک حسائی (عیسائی) جوان نے ایک گھوڑسوار کے گھوڑے کی لگام پکڑلی اور بجلی کی روشنی مں اس نے دیکھا کہ وہ پیارا سنگھ کا سالا کپورا سنگھ تھا "

تھانیدار صاحب مونچھوں پر انگلیاں پھیر پھیر کر صورت حال پر غور کرتے رہے پھر کہنے لگے ۔

" اچھا نمبردار تم چلو ہم تھوڑا کام ختم کر کے آتے ہیں خود موقعہ پر اس واردات کی جانچ پڑتال کریں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گھوڑی تو لائے ہو نا اپنی ؟ "

" ہاں جی "

نمبردار نے حقے کا آخری کش خوب گہرا لیا اور چلنے سے پہلے بولا

" اچھا ٹھانیدار جی ! صاب سلامت ۔ ۔ ۔ اب چلتے ہیں "

تھانیدار صاحب کو گاؤں پہنچنے تک کافی دیر ہو گئی ۔ ساڑھے گیارہ کے قریب پھونچے تو سارے ، گاؤں کو منتظر پایا ۔ گاؤں کے باہر ہی عیسائیوں کے گھر تھے ۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں انگریز اور امریکی ، مشنریوں نے بھنگیوں سے عیسائی بنایا تھا ۔ گاؤں والے انہیں حسائی یا کرسٹان کہتے تھے ۔ مردوں میں سے بعض نے خاندانی دھندا چھوڑ کر نئے نئے کاموں میں ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا تھا ۔ لیکن ان کی عورتوں میں سے اکثر اب بھی کوٹھے اٹھاتی تھیں ۔

" ان حسائیوں میں سے بعض اچھے جوان مانے جاتے تھے ۔ انہیں کے ایک جوان نے پچھلی رات کپورا سنگھ کی گھوڑی روکنی چاہی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا ۔ بجلی چمکی تو اس کی روشنی میں اسی نے کپورا سنگھ کو پہچان لیا تھا ۔ یہ نوجوان تھانیدار سے ملنے کے لئے بڑا بیتاب تھا ۔ جب تھانیدار صاحب گھوڑے پر سوار معہ چند سپاہیوں کے ادھر سے گزرے تو وہ اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیا ۔

سردی زیادہ تھی اس لئے نمبردار نے پیپل کی چھاؤں سے ہٹ کر گاؤں کی پرانی کچی فصیل کے پاس ان کا پلنگ اور اس پر شوخ لال رنگ کی دھاری والا کھیس بچھا دیا ۔ تھانیدار صاحب کے

بیٹھتے ہی نمبردار نے حقہ تازہ کر کے اس کی نے حضور کی ناک سے چھوادی - تھانیدار صاحب نے پینترا بدل کر ناک بچالی اور نے دانتوں میں داب لی -

آج نہ صرف پیر کے ڈھٹہ کے رہنے والے بلکہ آس پاس کے دیہات سے بھی لوگ ڈاکے کی خبر سن کر وہاں چلے آئے تھے - وہ خاصے بڑے حلقے میں بیٹھے خشک قانونی کاروائی کو بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے -

تھانیدار صاحب کے تیور بہت خطرناک ہو رہے تھے - بظاہر حقہ پی رہے تھے لیکن دماغ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا -

اتنے میں نمبردار نے ان کے کان میں کہا " وہ رہا حسائی جوان جس نے کپورے کو پہچانا تھا -

اب تھانیدار جی نے جلد جلد کش لینے شروع کئے اور حسائی جوان کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے :

" ذرا بلاؤ تو اسے "

نمبردار نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور حسائی جوان جو پہلے ہی بے قرار تھا اشارہ پاتے ہی کھٹ سے ان کے سامنے پہونچا اور بڑی پھرتی سے فرشی سلام کیا -

تھانیدار صاحب نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا - ابھی وہ بالکل نوجوان تھا مسیں بھیگ ہی رہی تھیں - رنگ کالا بھجنگ اور چمکدار - ہونٹ موٹے دانت سفید جن کی نمائش کرنے میں وہ ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیتا تھا -

تھانیدار صاحب کو اس کا الھڑپن اور اپنے روبرو اس کی یہ خود اعتمادی ذرہ برابر پسند نہ آئی - چنانچہ تحکمانہ لہجے میں پوچھا :

" تمہارا نام ؟ "

" بھسا "

" کام ؟ "

" حسائی ہوں مائی باپ "

" سچ سچ بتاؤ تم نے کیا دیکھا "

تھانیدار صاحب کی گرج سن کر حسائی کے ہونٹ خشک ہو گئے - زبان لڑکھڑا گئی -

" ابے بولتا کیوں نہیں ؟ " تھانیدار صاحب پھر کڑکے
" اوہ جی ۔ ۔ ۔ بات جی ۔ ۔ ۔ یہ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ "

تھانیدار صاحب نے اپنی دانست میں سب کچھ بھانپ کر نمبردار کی طرف خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا " دیکھا؟ سالا ، اب چھپانا چاھتا ھے ــــــــ اوئے طوطا سہنیاں ! "

طوطا سنگھ بڑا گرانڈیل ڈھیلی ڈھالی پگڑی والا اڑبینگ سکھ سپاھی تھا ۔ وہ جواب میں " ھاؤجی " کہہ کر تھانیدار کی طرف متوجہ ھوا ۔



" اوئے طوطا سہنیاں ! " تھانیدار صاحب کی چابک کے زناٹے کی سی آواز گونجی " اوئے لگاؤ تو جوتے اس حسائی کے "

طوطا سنگھ نے حسائی کی طرف ایسے دیکھا جیسے باز کبوتر کو دیکھتا ھے اور پھر اپنی مونچھوں کو زبان کی نوک سے چھوتے ہوئے اس نے یہ بڑا پنجہ آگے بڑھایا اور اس کی گردن ناپ لی ۔

حسائی کو معلوم نہیں تھا کہ تفتیش میں مدد دینے کے پاداش میں سب سے پہلے اسی کی گردن ناپی جائے گی ۔ اس نے بدن کو ذرا اکڑایا ، منمنایا ، تڑپا لیکن طوطا سنگھ نے دو چار ایسے بےڈھب جھٹکے دیئے کہ ساری چولیں ڈھیلی پڑ گئیں اور پھر طوطا سنگھ نے ٹھبی دے کر اسے زمین پر منہ کے بل گرایا اور اس کا تہبند ھٹا کر ھاتھ بھر کا جوتا ھوا میں لہرا دیا ۔

اب تماشائی بھی ذرا پاؤں پھیلا کر آرام سے بیٹھ گئے۔ انھوں نے جان لیا کہ اب کاروائی باقاعدہ طور سے شروع ہو گئی ہے۔

تھانیدار صاحب اٹھ کھڑے ہوئے انھوں نے ارد گرد بڑے اہم انداز سے نگاہ دوڑائی۔ حسائی کو مار پڑتے دیکھ کر انھیں گونہ اطمینان حاصل ہو رہا تھا۔ سنجیدگی سے سوچنے لگے کیا کریں آخر ہمیں بھی اپنی ڈیوٹی پوری کرنی لازمی ہے۔

کچھ سوجھی تو نمبردار کی جانب رخ کر کے بولا ”اوئے نمبردارا! چلو ہم اتنے میں موقعہ واردات بھی دیکھ آئیں۔“

”جو حکم“ کہہ کر نمبردار حقے سمیت آٹھا اور تھانیدار جی کی ناک کی جانب نے کا نشانہ باندھا ہی تھا کہ انھوں نے اشارے سے منع کیا ”ابھی نہیں“

راستے میں گاؤں کے چند سرکردہ اشخاص بھی ان کے ساتھ ہو لئے۔ مکان کے پچھواڑے سے گزرتے وقت تھانیدار صاحب دم بھر کو رکے۔ انھوں نے مکان کی بلندی کا جائزہ لیا اور نمبردار سے کہنے لگے!

”بھئی تم ٹھیک ہی کہتے ہو یہاں سے چھت پر پہونچنے کا کوئی ذریعہ تو ہے نہیں۔“

”دوسری بات یہ ہے جی کہ انھیں مکان کے سامنے سے داخل ہونے میں رکاوٹ بھی تو نہیں تھی۔“

تھانیدار صاحب نے نمبردار کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں: چپ رہو جی۔ زیادہ ٹرٹر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تھانیدار صاحب کو اپنے روبرو تفتیش کے سلسلے میں زیادہ بڑھ چڑھ کر رائے دینے والوں سے بڑی چڑ تھی۔

مکان کے سامنے پہونچے تو اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی بھاگ دوڑ کر چھپنے لگیں۔ تھانیدار صاحب بوٹوں پر ہلکے ہلکے چھڑی کی ضربیں لگاتے ہوئے عورتوں کے پردے میں چلے جانے کا انتظار کرتے رہے پھر انھوں نے باری باری سب گھروں کا معائنہ کیا۔ کوئی نشان باقی نہیں تھا اس گھر کے اور پڑوس کے

مردوں سے بات چیت ہوتی رہی لیکن خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

"عجیب ڈاکو تھے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہوا میں اڑتے ہوئے آئے اور زمین پر پاؤں رکھے بغیر اپنا کام کر کے اڑ گئے۔"

تھانیدار صاحب نے یہ کہہ کر ان لوگوں کو جن کے وہاں چوری ہو گئی تھی بڑے غور سے دیکھا جیسے بڑی اہم بات کہنے کو ہوں:

"یہاں تو یوں دکھائی دیتا ہے جیسے چوری کی واردات ہی نہیں ہوئی۔"

سب لوگ گھبرا گئے مبادا تھانیدار صاحب اپنی رپورٹ میں بھی یہی کچھ لکھ دیں اور انہیں جوتے الگ کھانے پڑیں۔ چنانچہ انھوں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی "جی چوری تو ہوئی ہے اس میں تو شک کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔"

"اچھا جی؟ ——" تھانیدار صاحب نے طنز کیا "اگر چوری میں کوئی شک ہی نہیں تو مجھے بتاؤ کہ چور کہاں ہیں —— ہونہہ! اس میں شک ہی نہیں - - - - - میں تو جب مانوں کہ چور میرے سامنے حاضر کرو - - -"

سب دم بخود رہ گئے۔ تھانیدار صاحب نے دل ہی دل میں اپنی پیٹھ ٹھونکی واہ! کیا مدلل گفتگو کی ہے میں نے —— کیا اب اس کا جواب دے بھی سکتا ہے کوئی؟

واپس آکر تھانیدار صاحب نے دھڑام سے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اوئے طوطا سہنیاں! ذرا حسائی کو میرے سامنے پیش تو کر۔"

حسائی کا حلیہ بگڑ چکا تھا اور اب تھانیدار صاحب کو آنکھوں دیکھی واردات سنانے کا شوق بھی غائب ہو چکا تھا۔ چہرہ اور بال گرد سے اٹ گئے تھے رانوں میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے کھڑا ہوا اور جب تھانیدار صاحب کے روبرو پہونچا تو اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

تھانیدار صاحب نے اس کے بگڑے ہوئے حلیے کا بڑے

اطمینان سے جائزہ لیا ۔ اور پھر مکھن سے تر حلق میں سے بولے : ” ھاں بے ! اب بات کر مجھ سے “

حسائی ھکلا کر رہ گیا ۔

” اے بد کے تخم منہ سے بول ورنہ پھر جوتے سے بات کروں گا ــــ باج خان ! سب دس نمبریوں کو گھیر کے توں ۔ ۔ ۔ دیکھتا ھوں چوری کا سراغ کیسے نہیں ملتا ؟ “

حسائی نے ھاتھ باندھ کر کہا ۔ ” موتیاں والیو ! میں تو یونہی سب کچھ بتانے کو تیار تھا “

” تو تو تیار تھا پر ھم تو تیار نہیں تھے ھاں اب تیار ھیں قلم بھی تیار ھیں بول ۔ ۔ ۔ “

” پادشاھو ! میں نے تو ڈاکوؤں کو پکڑنے کی کوشش کی تھی ۔ ۔ ۔ “

” بد کے تخم ! باتیں بنانا خوب آتی ھیں ــــ چاھے چوری بھی خود ھی کرائی ھو ــــ “

” توبہ ! موتیاں والیو ! سب نے دیکھا کہ کیسے میں نے ایک ڈاکو کی گھوڑی کی لگام پکڑلی تھی ۔ اس نے مجھ پر چھوی کا وار کیا ۔ وار خالی دینے کے لئے میں جو پیچھے ھٹا تو لگام میرے ھاتھ سے چھوٹ گئی ۔ “

” بھوتنی پتنگ ! جھوٹ بکتا ھے ۔ تو نے جان بوجھ کر لگام چھوڑی ھو گی “

” نہیں جی ماں کسم میں نے جان بوجھ کر نہیں چھوڑی تھی “

” ماں دے مترا ! بکواس کرتا ھے ھمارے سامنے ۔ ۔ ۔ بول پھر کیا ھوا ؟ “

بس جی اس وقت بڑے زور کی بجلی چمکی اور اس کی روشنی میں میں نے اسے پہچان لیا ۔ “

” کون تھا وہ ؟ سچ بتلا “

” جی وہ کپورا سنگھ تھا ۔ “

پیارا سنگھ نے جب صبح کے وقت سنا کہ ڈاکوؤں میں اس کا سالا بھی شامل تھا ۔ تو اسے بات پر یقین تو آگیا لیکن بات بڑی بدنامی کی تھی وہ یہ نہیں چاھتے تھے کہ جگ ھنسائی ھو ۔

جہاں تک مال کا تعلق تھا وہ برادری والوں کے زور دینے پر واپس ملنے کی امید بھی تھی ۔ چنانچہ وہ انگوچھے میں سو روپے کے نوٹ باندھ کر لے آیا اور عین اس سوال و جواب کے موقعہ پر انگوچھے کو آگے بڑھایا اور اس میں سے نوٹوں کی جھلک دکھا کر انگوچھا تھانیدار صاحب کے تکیے کے نیچے چھپا دیا ۔ تھانیدار صاحب نے تکیئے پر باقاعدہ کہنی ٹیکتے ہوئے اس کی بات سننے کو کان آگے بڑھایا پیارا سنگھ نے مدعا بیان کیا کہ اس کے سالے کا نام اسے بدنام کرنے کے لئے لیا جا رہا ہے ورنہ وہ بچارا تو بڑا بھلا آدمی تھا ۔

تھانیدار صاحب فوراً معاملے کی تہ میں پہونچ گئے اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے :

"سردار جی ! فکر نہ کرو ۔ میں شریف آدمی کی قدر کرتا ہوں ۔"

پیارا سنگھ نے گرم جوشی سے تھانیدار صاحب کا ہاتھ دباتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں کہا : "خان صاحب ہمیں بھی تو آپ ہی کا سہارا ہے ۔"

اب پھر تھانیدار صاحب حسائی کی جانب متوجہ ہوئے :

"کیوں بھوتنی پلستر ! اتنی مار کھاکر بھی ہوش ٹھکانے نہیں لگے ۔ تیری مؤں کو چور لیجائیں —— ہم بڑے ظالم لوگ ہوتے ہیں ۔ بس یہ سمجھ لے کہ مجرم کی ھڈی پسلی ایک کر ڈالتے ہیں ۔ ۔ ۔"

حسائی نے گھگھیا کر کہا ۔ "شہنشاھو ! مجھ سے کیا گلتی ہو گئی ؟"

"اوئے غلطی دیا پترا ! ایک تو اصل ڈاکوؤں کا پتہ نہیں بتاتے دوسرے سردار پیارا سنگھ کے رشتے داروں کو بدنام کرتے ہو ؟"

حسائی نے کانوں کو ھاتھ لگایا ۔ تھانیدار صاحب پھر بولے :

"خوب جانتا ہوں ۔ کہیں سردار جی نے تھوڑی سے بیگار لے لی ہو گی بس اسی کا زہر نکال رہے ہو اب"

"جی میری توبہ !" حسائی گھبرا کر بولا ۔ "بھلا میری کیا مجال جو میں ایسی باتیں کروں ۔ کہاں سردار صاحب اور کہاں

میں - کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی ! "

"اے بل بتورے! سچ سچ بتانا؟ آئیں بائیں شائیں کیا ھانک رھا ھے"

" بادشاھو مجھے ضرور دھوکا ھوا ھوگا - وہ کپورا سنگھ نہیں تھا . . . "

" طوطا سہنیاں!" تھانیدار صاحب نے جلال میں آ کر کہا - " یہ لونڈا تو پورا دس نمبریا معلوم ھوتا ھے اچھا اب تھانے میں پہونچ کر اس سے اگلوائیں گے سچی باتیں. . . "

اتنے میں باج خاں نے بتایا کہ سب دس نمبریئے حاظر ھیں - اس پر نمبردار نے کہا - "شہنشاھو! آپ بڑی سخت ڈیوٹی دیتے ھیں - اب تو کھانا کھا لیجئے - اس طرح بھوکا رہ کر انسان کب تک کام کر سکتا ھے؟

تھانیدار صاحب کو یہ تجویز پسند آئی -

" اچھی بات باج خان ! ہم کھانا کھا لیں ––– میں نے کہا نمبردار ! سپاھیوں کو بھی کھانا بھجوا دو - پھر ذرا ان دس نمبریوں سے نبٹیں گے - - - - - ٹائم کم ھے - - - - - سردیوں کے دن تم جانتے ھی ھو ادھر سورج چڑھا ادھر ڈھلا - "

نمبردار نے چار مرغ اور زردہ تیار کروا رکھا تھا - کھانا نمبردار کے گھر سے آیا اور کھایا گیا پیارا سنگھ کی بیٹھک میں -

کھانا کھاتے وقت تھانیدار نے آھستہ سے پیارا سنگھ سے کہا - " پیارا سنگھ جی آپ بہت پیارے ھیں - "

پیارا سنگھ نے نہال ھوتے ھوئے ڈاڑھی آگے بڑھائی " خان صاحب آپ جیسا پیارا اپھسر بھی پہلے یہاں کبھی نہیں - - - - - "

"اور ھاں پیارا سنگھ سردار ، بات یہ ھے کہ ایک ھرا پاپا (سبز پتہ یعنی سو کا ایک نوٹ) سپاھیوں کے لئے بھی چاھیئے - حسائی نے تو بک ھی دیا ھے ایسا نہ ھو کہ میں تو اس کی بات کا یقین نہ کروں لیکن سپاھی یقین کر بیٹھیں - آپ تو سمجھ دار آدمی ھیں - آخر ان کے منہ میں بھی تو ھڈی جانی چاھیئے باقی رہ گیا میں - میں ٹھہرا گھر کا آدمی - مجھے آپ خواہ ایک کوڑی بھی نہ دیں - کیوں نمبردار میں جھوٹ تو نہیں کہتا ؟ "

"نا جی ، آپ اور جھوٹ ؟ - بلے بلے - - - - کیسی باتاں کرتے

ہیں آپ !"

پیارا سنگھ نے دلگیر آواز میں کہا - " خاں صاحب بات تو کچھ نہیں لیکن ایک تو ہمارے یہاں چوری ہو گئی ، بدنامی ہو رہی سو الگ ، ----- اور ----"

"کیسی بھولی باتیں کرتے ہیں جی آپ -" تھانیدار صاحب نے سمجھایا - " چوری تو میرے بس کی بات نہیں - رہی بدنامی کی بات - میرے ذمے رہنے دیجئے - کیوں نمبردار میں جھوٹ کہتا ہوں - "

" ارے توبہ ! "

" بولئے سردار جی منظور کہ نامنظور ؟ نمبردار بول اٹھا " منجور جی منجور ہے ---- سردار جی تو بڑے بیبے آدمی ہیں - "

کھانا کھا کر انگوچھے سے ہاتھ پوچھتے ہوئے تھانیدار صاحب نے کہا - " بھئی نمبردار حقہ منگواؤ جھپ سے - یہیں پر ذرا آرام سے دو چار کش لگا لیں - پھر وہی گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانا پڑے گا - وہاں حقہ پینے کا مزا کہاں "

نمبردار کی باچھیں چری جارہی تھیں وہ جانتا تھا کہ پیاراسنگھ کی دوسری قسط میں سے اس کی مٹھی بھی گرم کی جائے گی -

کچھ دیر تک تھانیدار صاحب آنکھیں موندے خوب گھرے گھرے کش لگاتے رہے اور پھر بولے " یار مزا آگیا ! آنکھوں تک تراوت پہونچتی ہے - "

" کہاں صاحب ! تمباکو کی تعریف کیجئے - لوہے کی پیٹی میں بند رکھتا ہوں اس کو - آپ آتے ہیں جبھی میں نکالتا ہوں اس تمباکو کو - "

تھانیدار صاحب نے نمبردار کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا - " اوئے نمبردار ! نہیں ریس تمہاری - جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی --- لو اب چلیں ڈیوٹی پر --- گورنمنٹ کا نمک کھاتے ہیں نمک حرامی کرنا ہے کام شیطان کا ---- اوئے نمبردارا ، سپاہیوں کو کھانا بھجوا دیا تھا - "

" ہاؤ جی - کبھی کا "

دس نمبریئے دھوپ میں بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے - ان میں مولا تو خیر خلیفہ تھا ہی - تھانیدار کو آتے دیکھ

کر سوداگر ذرا گھبرا سا گیا مولا سے بولا :

" آستاد ! تم نے کھوب پھنسایا ، ہم نے کھام کھاہ (خواہ مخواہ) چوری کروائی "

مولا نے چلم میں سلگتے ہوئے اپلے کے ٹکڑوں کو چمٹی سے کچھ کے دبتے ہوئے کہا ۔

" سدا گرا ! یہ تیرا پہلا موکا ہے جوتے پڑیں تو گھبرانا نہیں ۔ کیونکہ اب تو ایک ترپھ کھائی دوسری طرپھ کھندک ۔ اگر منہ سے بک دیا تو یاد رکھیو ورسو جندہ نہیں چھوڑنے کا ۔ کچہری پہونچنے سے پہلے ترا گلا گھپ دے گا ۔ ۔ ۔ "

یہ کھائی اور خندق والی بات سن کر سوداگر کو دن میں تارے نظر آنے لگے ۔ حوصلہ بلند کر کے بولا ۔

" یا استاد ! کھالیں گے مار ۔ مار ہی تو ہے ۔ جان تو نہیں لے لیں گے ۔ اور پھر لوٹ میں ہم کو بھی تو کچھ ملے گا ہی ۔ ارے گھبرانے والی آسامی ہی نہیں ہیں ہم "

" ساباش بجورے " مولا نے مونچھیں پھڑا کر کہا ۔ " ایسا نہ ہو کہ پہلے ہی جوتے پر چیں بول جاؤ ۔ "

چند سپاہی پاس کھڑے تھے ان میں سے ایک نے ڈانٹ کر پوچھا :

" ابے مولو یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں ؟ "

" اوئے حولدار باتیں گھربار کی ہو رہی ہیں ہم گھر بار والے لوگ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

میکو نے دھیمے سے کہا " ہماری باتیں سن لی ہیں انھوں نے "

" اوئے سننے دے " مولا نے بے پرواہی سے کہا ۔ " ان جھین جھپاڑوں کی پرواہ کیا ہے ۔

اسی اثنا میں تھانیدار صاحب بھی آن پہونچے ۔ سب سے پہلے ان کی نظر مولا پر پڑی اور مولا چشم زدن میں خوشامد کا پتلا بن گیا ۔ تھانیدار کا اشارہ پاتے ہی اپنی گڑگڑی اٹھا کر بھاگا بھاگا قریب پہونچا اور فوراً جھک کر فرشی سلام کیا ۔

تھانیدار صاحب کے تیور بگڑے ہوئے تھے ۔ غرا کر بولے " کیوں بے بھوتنی پتنگ ! یہ بات کیا ؟ "

" بات ؟ " مولا نے انتہائی معصومیت سے گردن آگے بڑھا کر

تعجب سے پوچھا :
" اے مکوڑ کہیں کے ، بنتا ہے ؟ بتا یہ روز روز کیا قصے کھڑے ہو رہے ہیں ۔"
" جی میں نے تو کوئی کسہ کھڑا نہیں کیا "
"تیری بے بے کو لے جائیں چور ۔ چادرھو ۔ سالہ ابھی چار دن نہیں گذرے کہ وہ بندوق والا قصہ کھڑا کیا اور اب یہ ڈاکہ !"
" موتیاں والیو ، یہ کسہ تو سمجھئے آپ ہی کا قصہ ہے ہم گریب کیا جانیں ؟ "
" سالے تو کیا ہم ڈاکوؤں کے یار ہیں ؟ "
" اوئے جبرجستو (زبردستو !) میں آپ کو تو کچھ نہیں کہہ رہا ہوں ۔ میرا متبل یہ ہے کہ ڈاکے چوری کے ماملوں کو سمجھنا اور پرکھنا تو آپ جیسوں کا ہی کام ہے ۔ بدشاہو ! ہم تو آپ کے گلام ہیں ۔ "
" دیکھ اوئے مولیا ! میں آدمی ہوں بہت سخت ۔ سمجھا ؟ تو نے میرے ھاتھ نہیں دیکھے "
مولا نے بے کیف لیکن بھاری آواز میں کہا ۔
" دیکھے ہیں پدشاھو ! دیکھے ہیں ۔ اس الاکے (علاقے) میں کوئی ٹھانیدار ایسا نہیں آیا جس کے ھاتھ ہم نے نہ دیکھے ہوں ۔ "
" بس تو اب دیر مت کرو ۔ ڈاکے کے بارے میں جو کچھ جانتے ہو ۔ صاف صاف بیان کرو ۔ "
مولا نے گڑگڑی کا لمبا کش لیا اور زمین پر آلتی پالتی مارتے ہوئے بولا " بس صاب اتی سی بات ہے ؟ ایک بار نہیں ھجار بار میں آپ کو ساری بات بتانے کو تیار ہوں ۔ بھلا ھمارا اور کام ھی کیا ہے موتیاں والیو ! "
" فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو ۔ "
" اچھا جی بوھت اچھا جی ۔ بات یہ ہے کہ کل میں گھر پر سویا پڑا تھا ۔ ۔ ۔ "
" سویا پڑا تھا ؟ "
" ھاؤ جی "
" ھاؤ جی کے بچے —— شام ھی کو سو گئے تھے ۔ "

" اجی متبل ہے کہ میں لیٹا ہوا تھا ۔ "

" بیان بدلتا ہے بچو ! "

" نئیں جی بیان کیوں بدلیں ۔ مرد کی ایک جبان ہوتی ہے "

" ہمیں آلو بناتا ہے ؟ "

" نہیں پدشاہو ! — میرا متبل یہ کہ میں لیٹا ہوا تھا — اب یہ باریکیاں تو موتیاں والیو آپ ہی کو سوجھ سکتی ہیں "

اس بات کا تھانیدار صاحب کے دل پر خوشگوار اثر ہوا ۔ انھوں نے کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھا کہ لوگ باگ مولا کے یہ تعریفی کلمات سن رہے ہیں یا نہیں — پھر مولا سے بولے :



" ہاں بے آگے چل "

" جی تو اتنے میں بڑے زور کا شور ہوا ۔ "

" شور کیسا ؟ آندھی کا ؟ "

" اجی آندھی کا شور تو پہلے ہی سے ہو رہا تھا میرا متبل ہے گاؤں والا کا شور ہوا — بڑے جور سے "

" گاؤں والوں کا شور ——— اور بس ؟ "

معاً " مولا کو احساس ہوا کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے ۔ فوراً ہنس دیا :

" بڑا رعب ہے کھان صاب آپ کا ۔ بات بھلا دیتے ہیں — آپ تو بات بات پر جبان پکڑتے ہیں ۔ "

" بیٹا زبان پکڑنے کی تو تنخواہ ہی پاتے ہیں ہم ۔ اچھا آگے بول "

" بس جی میں حقہ پی رہا تھا اور باتیں کر رہا تھا ۔ ۔ ۔ "
" باتیں ؟ — کس سے ؟ "
" جی یہی لبھو، سداگر، میلا سنگھ میرے پاس بیٹھے تھے "
" اوئے طوطا سنگھ ! بلاؤ ان کو بھی "
لبھو، سداگر اور میلو نے جھرجھری لی اور تہبند پھڑپھڑاتے ہوئے آگے بڑھے ۔
" ہاں بے سداگر، میلو، لبھو، کیا تم لوگ کل شام مولا کے ساتھ تھے ؟ "
" ہاں جی "
" ہاں جی کے بچے ۔ معلوم ہوتا ہے آپس میں مشورہ کر کے آئے ہو ۔ "
" نہیں جی "
" بھوتنی کے "، پھر تھانیدار صاحب نے نمبردار سے مخاطب ہو کر کہا ۔
" ان کی صورتیں تو دیکھو ۔ ۔ ۔ حرام کے تخم "
" پادشاہو ! ہم بل کل سچ بول رہے ہیں "
" اچھا تو مولا کیا کر رہا تھا "
" حقہ پی رہا تھا "
" نہیں جی سو رہا تھا "، دوسرا بولا
" نہیں جی باتیں کر رہا تھا " تیسرا بولا
" اور تم کیا کر رہے تھے ؟ "
" ہم بھی باتیں کر رہے تھے "
" کیا باتیں کر رہے تھے ؟ "
" آپ کی باتیں کر رہے تھے "
تھانیدار صاحب نے پھر نمبردار سے مخاطب ہو کو کہا :
" دیکھا ان مئوں کے یاروں کو ۔ " پھر ان چاروں کی طرف دیکھا " ہاں تو میری کیا باتیں کر رہے تھے "
" ہم یہی کہہ رہے تھے کہ کہان صاحب بڑے اچھے اپھسر ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "
" اچھے افسر ہیں —— ہوں ! "
" ہاں جی —— اور بڑے روب دار ہیں "

" رعب دار بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا جی ؟ اور کیا ؟ "

" ہم کہہ رہے تھے کہ یہ الا کا کھاس پھجل ہے جو ایسا حاکم ہمارے الاکے میں مکرر ہوا ہے ۔ ان کے راج میں نہ چوری نہ ڈکیتی نہ کتل ۔ آدھی رات کو ویرانے میں سونا اچھالتے چلے جاو کوئی پوچھتا نہیں تمہارے منہ میں کے دانت ہیں "

" ہوں خوب جانتا ہوں ۔ سالو ! مجھے مکھن لگا رہے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا مولا اب مذاق تو ختم ہوا ۔ اگر میں اپنی سی پر آگیا تو یاد رکھو ہڈی پسلی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی ۔ اس لئے جو بات ہے سو حرف بحرف بیان کر دو "

مولا نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا " موتیاں والیو (والو) ہم تو ایک ایک بات بتا دینا چاہتے ہیں ۔ ہم چاہتے ہیں کہ ڈاکو گرفتار ہوجائیں ۔ نہ جانے کون بدجات یہ کام کرتے ہیں اور آپھت آتی ہے ہم پر ۔ بد اچھا بدنام برا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں اوئے سوداگر ! "

تھانیدار صاحب نے دانت پیستے ہوئے کہا :

" مولا بہت دنوں سے تمہاری چمڑی نہیں ادھیڑی میں نے ۔ اسی لئے زبان گز بھر کی ہوگئی ہے ـــــ جو بات ہے جلد از جلد بک ڈالو ۔ "

مولا نے کھانس کر ازسر نو کہنا شروع کیا ۔

" بس جی ہم باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں گولیاں چلنے لگیں "

" کتنی گولیاں چلیں "

" کیوں بھئی سداگر تم نے گولیاں گنی تھیں ؟ " مولا نے انجان بن کر پوچھا ۔ " میرے کھیال میں تین گولی چلیں ۔ "

" تین ؟ ـــ سوچ کر جواب دو "

" ہا جی تین "

" جھوٹ بولتے ہو "

" جی ہم نے تین ہی سنی تھیں "

تھانیدار صاحب نے سوچا کڑے دانے ہیں " اچھا پھر کیا ہوا "

" بس جی پھر کیا تھا ایسا شور مچا کہ پناہ کدرت (قدرت)

کی ادھر آندھی کا زور اُدھر کھلکت (خلقت) کا شور ۔ ۔ ۔ چور چور کی آوازیں آئیں "

" تم کچھ نہیں بولے "

" ہم کیا بولتے جی ۔ جو ھتھیار ملا لے کر باھو نکل آئے "

" پھر تم نے کیا دیکھا ؟ "

" دیکھتے کیا ۔ چاروں طرف اندھیرا گھپ تھا ۔ پچھلی گلی سے آوازیں آ رھی تھیں ھم اُدھر کو دوڑے ۔ دیکھا لوگ بھاگے چلے آ رھے ھیں ھم بھی ان کے ساتھ ہو لئے ۔ "

" تم نے کسی سے پوچھا نہیں کچھ "

" جی چور چور کا شور مچا تھا ــ پوچھنے کی بات کیا تھی ؟ "

" گویا تم نے بھی چوروں کا پیچھا کیا "

" ھاں جی سارا گاؤں گواہ ھے "

" مثلاً کون ؟ ــ کسی کا نام لو "

" اجی ــ لدھا ، پھگا ، چھنو سبھی نے دیکھا تھا ھمیں "

جب لدھا ، پھگا ، چھنو وغیرہ آگے بڑھے تو مولا نے ان کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ۔ " بولو بے "

" ھاں جی یہ ھمارے ساتھ تھے "

مولا نے پھر کہا " اور تو اور سردار پیارا سنگھ سے پوچھئے انہیں بھی ملے تھے ھم ؟ "

تھانیدار صاحب نے پیارا سنگھ کی طرف دیکھا ۔ ادھر مولا نے پیارا سنگھ کی آنکھوں میں پر معنی انداز میں آنکھیں ڈالتے ایک آنکھ مار دی ۔ پیارا سنگھ جانتا تھا کہ اگر وہ مولا کے حق میں نہ بولا تو وہ کپورا سنگھ کا نام لے کر پکڑوا دے گا اسے ۔

" پیارا سنگھ جی ! مولا ٹھیک کہتا ھے ؟ "

" ھاں جی "

یہ سن کر مولا کو اطمینان ھوا ۔

اب تھانیدار صاحب نے پوچھا " مولا ، تم بھی حسائی کے پاس کھڑے تھے ؟ "

" ھاں جی ــ "

" تم نے گھوڑسوار کو دیکھا تھا ؟ "

" کیا وہ کپورا تھا "

اس پہ مولا نے لمبا کش لے کر پیارا سنگھ کی جانب دیکھا مولا علاقے بھر کے بڑے بدمعاشوں میں سے تھا چاھتا تھا کہ اسی بات پر پیارا سنگھ سے کچھ اینٹھے لیکن ڈاکے کی سازش میں خود بھی شامل تھا اس لئے مجبوراً ٹھنڈی سانس بھر کر بولا : ”جی نہیں کپورا نہیں تھا “

” تم اسے پہچانتے ہو “

” جی نہیں “

اب تھانیدار صاحب سمجھ گئے کہ ڈاکے میں مولا کا ھاتھ بھی تھا ۔ کیوں کہ یہ تو وہ پہلے ھی جان گئے تھے کپورا ڈاکوؤں میں شامل تھا مولا کا اسے بچانے کا مقصد صاف تھا ۔ وہ اصلیت کو چھپا رہا تھا ۔ چنانچہ انھوں نے ایک بار پھر مولا سے آنکھیں چار کیں ۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھ گئے تھ ۔ مولا نے اللہ سے دعا کی کم از کم سداگر کی ھمت نہ ٹوٹ جائے —— تھانیدار صاحب بولے ۔

” تم لوگ ذرا سخت دانے معلوم ہوتے ہو ۔ سیدھی انگلیوں سے گھی نکلتا نظر نہیں آتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اوئے طوطا سہنیاں ! ان کو اوندھے منہ لٹا کر کڑاہ پرشاد کھلاؤ “

طوطا سنگھ نے مولا کے کندھے پر ھاتھ رکھا تو وہ پھرتی سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور سنجیدگی سے بولا :

” صبر سے کام لو حولدار طوطا سنگھ ! ہم بھاگے تو نہیں جارھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم بھی اجت ابرو والے آدمی ھیں “

یہ کہہ کر اس نے ادھر آدھر دیکھا اور زور سے آواز دے کر بولا :

” پھگیا ! جرا میرا حکا پکڑنا “

پھگے نے آگے بڑھ کر حقہ تھام لیا ۔

مولا نے ساتھیوں سے سرگوشی میں کہا :

” لو بھائی تیار ہوجاؤ “

پھر اس نے خود بھی تہبند کا پلو چھانٹ کر بڑے زور سے کس کر گرہ لگائی اور طوطا سنگھ کی طرف دیکھ کر بولا !

” ہاں بھئی حولدار ! اب بتاؤ کہاں لیٹیں ؟ “

ہاجرہ مسرور



وہ اور ہم

ایک ہاتھ میں منشی فاضل کے کورس کی کتابیں تھیں اور دوسرے میں غرارے کے پائنچے، پان کی پیک اور ناک تھوک سے بچائے ہوئے۔ ...سامنے سے بس آرہی تھی جو مجھے "پنجاب سے امتحان پاس کرانے کی گارنٹی دینے والے کالج" پہنچا سکتی تھی۔ بندر روڈ کا ٹریفک اور پھر شام کا وقت، میں اندھادھند بس سٹاپ کی طرف جانے کے لئے سڑک پار کر رہی تھی — کہ کسی نے میرے دوپٹے کا پلو پیچھے سے کھینچا۔ جب سے یہ منشی فاضل پاس کرنے کا سلسلہ ہوا تھا اور مجھے گھر سے اکیلے آنے جانے کی اجازت مجبوراً دی گئی تھی تو ایسے واقعات سے کئی بار دوچار ہونا پڑا، بھائی جان نے مجھے کئی بار سمجھایا تھا کہ کراچی میں ماشاءاللہ ایک سے ایک نازک مزاج اور قدامت پسند غنڈہ مہاجر بن کر پہنچ گیا ہے اسی لئے حتی الامکان صبر کر کے اپنی راہ لگ لیا کرو۔ ورنہ اغوا ہو جانے سے لیکر چھری تک کھانے کا امکان موجود ہے۔ مگر میں جو اب نہایت خراٹے سے عورتوں کی آزادی وغیرہ کے مسائل پر بحث کر سکتی تھی، تو یوں ہی چپ رہنے کے لئے تھوڑی۔

دوپٹہ کھینچے جانے پر میں نے پلٹتے پلٹتے زور سے گالی دی — "الو" اور جب دیدے غصے سے نکال کر ادھر دیکھا تو وہ الو نہیں گلو میاں تھے۔"

"ارے! ہائے گلو میاں۔" ہم دونوں ایک تیز رفتار

ٹرام کی زد سے بچ کر اور ایک بڑی سی امریکی کار سے کنی کترا کر سڑک پار کر گئے -

ظاہر ہے میری بس جا چکی تھی — گلو میاں حیرت سے گھور گھور کر میری طرف دیکھ رہے تھے - مجھے ذرا لطف آیا ، میں سمجھ گئی میرے اچھے کپڑے بے پروائی سے سر پر پڑا ہوا میرا دوپٹہ اور بے نقاب چہرہ گلو میاں کو مرغوب کر چکا ہے — میں نے بڑے وقار سے اپنی کتابیں پہلو میں سنبھالیں —

" آپ تو بالکل بدل گئیں کرانچی آ کر بٹو آپا ؟ " گلومیاں نے ذرا گھبرا کر کہا - " ہاں مگر تم تو بالکل نہیں بدلے - " میں نے ذرا بے پروائی سے کہا ، در اصل مجھے گلو میاں کے منہ سے اس وقت " آپا " سن کر تکلیف سی ہوئی ، لکھنؤ میں وہ لڑکا سا تھا — وہ مجھ سے ایک سال کے قریب چھوٹا تھا ، مگر اب پورا مرد ، اور میں نے ابھی منشی فاضل کے فارم میں اپنی عمر سولہ سال لکھی تھی - پرانے لوگ جب کسی کے نئے ماحول میں ملتے ہیں تو وہ کتنے تکلیف دہ ہو سکتے ہیں اسی بات کا احساس مجھے اس وقت شدت سے ہوا -

میں نے دور بندر روڈ پر نظر دوڑائی کہ کوئی بس آرہی ہے یا نہیں -

" آپ سکول جانے لگیں بٹو آپا - " گلو میاں نے سادگی سے پوچھا -

" نہیں کالج جاتی ہوں میں " میں نے کالج پر زور دیا - اور پھر بس کو آتا دیکھ کر مجھے ایک دم گلو میاں پر رحم آ گیا یہ بھی خیال آیا کہ میں نے اس کا حال چال تو پوچھا ہی نہیں -

" کب آئے - اور سب کہاں ہیں ؟ " میں نے جلدی سے پوچھا -

" اے لو ، آپ کو لکھنؤ سے خبر نہیں ملی - میں تو اماں اور بھیا کو لے کر چھ مہینے سے کرانچی آیا ہوا ہوں —— وہاں بھائی جان سے تو آپ کو معلوم ہے کہ ہماری —— " گلو میاں تفصیل میں جانے لگے اور بس قریب آ رہی تھی ——

" ہائے اللہ بس آ گئی - تم ہمارے ہاں ضرور آنا گلو میاں - پتہ لکھ لو —— اچھا ٹھہرو —— میں نے جلدی سے ایک کتاب کھولی کیونکہ مجھے یاد آیا کہ میرے پتے کا ایک عید کارڈ صفحات

میں نشانی کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔

"یہ لو۔ اس پر پتہ لکھا ہے ہمارے گھر کا —— آنا ضرور اچھا۔" کارڈ گلو میاں کو تھما کر میں جلدی سے بس میں بیٹھ گئی ——

بس چل پڑی تو مجھے خیال آیا کہ میں نے یہ معلوم کئے بغیر گلو میاں کو گھر کا پتہ دیدیا ہے کہ ان کے اپنے پاس رہنے کا ٹھکانا ہے یا نہیں —— دو ایک بار ایسا ہوچکا تھا کہ تین کمروں کے ہمارے فلیٹ میں اسی طرح کئی کئی ماہ کے لئے عزیز رشتے دار آکر مہمان رہ گئے۔ ان میں سے ایک نے تو ہمارا آدھا فلیٹ بھی الاٹ کرانے کی سکیم بنالی تھی۔ اماں کا حکم تھا کہ اب ایسی مروت بند —— میں ڈری —— لیکن پھر سوچا کہ چھ مہینے سے ہیں تو کہیں ہوں گے ہی —— سڑک پر تو نہ بیٹھے ہونگے۔ بہر حال اماں کے خیال سے مجھے کچھ الجھن سی ہوئی۔ میں نے گھر واپس پہنچ کر دبی زبان سے اپنی حماقت کا ذکر کر دیا۔ مگر ہمارے خدشے بے بنیاد ثابت ہوئے گلو میاں ہمارے گھر پہنچے ہی نہیں —— اور مجھے نا معلوم سا دکھ ہوا۔

گلو میاں در اصل دور کے رشتے سے میرے بھائی ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ان کے ابا زندہ تھے تو ان لوگوں کی خاصی اچھی گزر بسر ہوتی تھی۔ وہ تھے تو معمولی سے سرکاری ملازم مگر رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ معلوم ہوتا خاصے امیر لوگ ہیں۔ مرنے سے چند سال پہلے جب جنگ چھڑی اور پٹرول کی قلت ہوئی تو انھوں نے کہیں سے ایک پرانی موٹر بھی خرید ڈالی جو ان کی کشادہ آبائی ڈیوڑھی میں کھڑی پٹرول کی قلت کا رونا روتی نظر آئی۔ کبھی کبھار جب وہ اپنے کسی عزیز رشتے دار کے ہاں جاتے تو یہ موٹر استعمال ہوتی اور نتیجے میں خاندان والوں پر بڑا رعب پڑتا۔ ویسے تو خاندان میں سبھی ان سے جلتے لیکن ان سے ملے بغیر بھی کسی کو قرار نہ تھا۔ ان کے بڑے لڑکے شہباز نے جب بی۔ اے پاس کیا تو گھر گھر ان کی دعوتیں ہوئیں۔ آخر تو ہر گھر میں لڑکیاں بیٹھے بیٹھے ٹوٹی امیوں کی طرح زرد ہو رہی تھیں۔ ویسے تو شہباز کے ساتھ میرے بھائی جان نے بھی بی۔ اے کیا تھا مگر اتنی پوچھ ان کی کہیں نہ ہوئی اس کے باوجود میری اماں نے بھی اپنی سونے کی انگوٹھی رہن رکھ کر

شہباز کو مع اس کے گھر والوں کے مدعو کیا ۔ وہ لوگ موٹر میں آئے ۔ مجھے یاد ھے تمام دن سل پر مصالحہ رگڑتے رگڑتے میرے ھاتھ مرچوں سے سوج گئے تھے اور میں کٹورے میں ٹھنڈا پانی بھرے شام سے کوٹھری میں بیٹھی یہی سوچتی رھی تھی کہ آج کیا پہنوں ۔ جب شبو میاں اپنے ابا کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے تو میں نے انہیں تنہائی میں کواڑ کی اوٹ سے کئی بار جھانکا تھا ۔ ان کا معمولی سا سانولا چہرہ اور سیدھے سیدھے بال ، مجھے کتنے عجیب لگے تھے ۔ اماں نے مجھے آواز دے کر بلایا کہ آؤ سب کے ساتھ کھاؤ ، اس دن اماں بے حد آزاد خیال ھو گئی تھیں ۔ کیونکہ شبو میاں کے ابا ظاھر ھے کہ آزاد خیال تھے جبھی تو ان کی بیٹی مسلم سکول کی نویں کلاس میں پڑھتی تھی ۔ اور جو اس دن اپنے ابا اور بھائی جان کے سامنے بیٹھی چمچے سے پلاؤ کھا رھی تھی ۔ جی ھاں چمچے سے، وہ چمچے جو ھم نے خاص طور پر اس دعوت کے لئے پڑوسن سے عاریتاً لئے تھے ۔

اس رات بہت دیر تک اماں بھیگی چار پائی پر لیٹی پنکھا جھل جھل در بھائی جان سے باتیں کرتی رھیں ۔ باتیں کیا بس یہی کہ بٹو کے لئے شبو میاں اور بھائی جان کے لئے شبو کی بہن ۔ جوڑ خوب رھے گا ۔ حالانکہ بعد میں سنا کہ شبو میاں کا رشتہ پہلے ھی شبو میاں کے ابا اپنے ایک داڑھی والے افسر کی بیٹی سے طے کر چکے ھیں آخر تو وہ رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے جانتے تھے کیا چیز کہاں سجے گی ، اور موٹر میں پٹرول نہ ھو تو چھکڑا اور موٹر برابر ھے ۔

چالاک دکان دار بھاؤ تاؤ کرنے کے بجائے اپنی چیزوں کو سجا کر رکھتا ھے اور ان پر قیمت کا کارڈ لگاتا ھے ، اسی طرح انہوں نے اپنی ابائی ڈیوڑھی پر موٹر کا جھومر سجایا تھا —— اور اپنے بچوں کے مستقبل کی قیمت لگا دی تھی —— مگر جب وہ حرکت قلب بند ھونے سے چل بسے تو اسی ایک چنگاری سے ساری رونق سلفا ھو گئی —— موٹر دوسرے دن استاد صدیق کے گیرج میں پڑ کر گاھک پھنسنے کا انتظار کرنے لگی ۔ یہی نہیں بلکہ استاد صدیق نے ڈیوڑھی پر آ کر بھرے رشتے داروں میں اندر کہلوایا " بہن خان صاحب تو دل کی دل میں لے گئے شبو میاں

تو ماشاءاللہ سے بی - اے پاس ہیں لیکن گل میاں بیچارے اب کس کے سہارے پڑھیں گے - ابھی لڑکپن ہے میری گیراج آئیں جائیں گے تو انشاءاللہ ہنر سکھا دوں گا ——"

مگر استاد صدیق کی یہ مخلصانہ پیشکش گلو میاں کی اماں کے دل پر چوٹ دے گئی - یا تو رو رہی تھیں یا کڑک کر بولیں - " اے کیا کمی ہے گھر پر - اللہ رکھے میرا گل بی - اے چھوڑ کر ایم - اے پاس کرے گا - ولایت جائے گا - صدیق سے کہنا بیگم کہتی ہیں تم تو موٹر بکوا دو - یہ ان کی یادگار مجھے رلاتی ہے - اللہ میرے بیٹوں کی عمر دراز کرے وہ نئی موٹر لے لیں گے —— " یہ تڑک بڑک دیکھ کر دوبارہ سب مرعوب ہو گئے -

لیکن اس کے باوجود جب تک ہم لوگ لکھنؤ رہے ہم نے ان کی ڈیوڑھی سونی ہی دیکھی -

شبو میاں اپنے سسر کے زور پر جلدی ترقی کے وعدے پر کلرک لگ گئے گلو میاں نے لڑھک لڑھکا کر میٹرک پاس کرلیا - جوان بہن اپنے ابا کی زندگی ہی میں میٹرک تھرڈ ڈویژن میں پاس کرچکی تھی اور بقول اپنی اماں " اب ماشاء اللہ گھر داری سیکھ رہی تھی گھر بیٹھی " —— ہم لوگ اب ان کے گھر زیادہ جاتے کیونکہ شبو میاں کی بہن جہاں بچے پیدا کرنے میں تیز تھی وہیں گھر کا بھانڈا پھوڑنے میں بھی طرار —— وہ ہمیشہ سب سے شکائتیں کرتی رہتی کہ اس کی قسمت پھوٹ گئی —— ان کے گھر آئے دن دانتا کل کل ہوتی اور رشتے داروں کو لطف آتا - گلو میاں کی اماں جو اب بھی نہایت نفاست سے اس رکھ رکھاؤ کی نقاب میں بیل بوٹے کاڑھا کرتیں ، وہ دم کے دم میں کھسوٹ کر پھینک دی جاتی - جوان بہن سر جھکائے گھر داری سیکھتی رہتی اور گلو میاں چار پائی پر پڑے کروٹیں بدلا کرتے —— یا پھر ہم جیسے رشتے داروں سے نہایت خلوص کے ساتھ اپنے مسائل پر بات کیا کرتے -

پھر ہم لوگ پاکستان چلے آئے —— بھائی جان کالج میں لکچرر ہو گئے ، اور ہم جیسے پچھلی تمام تکلیفوں کو بھول گئے —— مجھے شبو میاں بھی کبھی یاد نہ آئے جنھیں میں نے کواٹر کی اوٹ سے جھانکا تھا اور تصور ہی تصور میں جن کے بچے کو میں نے اپنا

دودھ پلایا تھا ۔ اب تو مجھے یہی بات عجیب معلوم ہوتی کہ بچے کو دودھ پلایا جائے ۔ ہمارے فلیٹ کے اڑوس پڑوس کی کئی عورتیں بچوں کو بوتل کے دودھ پر کیا مزے سے پال رہی تھیں آخر ـــ مجھے اپنے ماحول اور ذہنی تبدیلیوں کے احساس سے جو خوشی ہوتی تھی وہ پرانے جاننے والوں اور رشتے داروں سے مل کر اور بھی چمک جاتی ، ـــ گلو میاں کے نہ آنے سے ظاہر ہے مجھے اندر سے دکھ سا ہوا تھا ۔

ایک دن میں اور بھائی جان کہیں جانے کے لئے نکلے تو گلو میاں کو بندر روڈ پر منہ اٹھائے جاتے پکڑا ۔

" ارے گلو میاں واہ ، آئے کیوں نہیں ہمارے ہاں ، ہم نے انتظار کیا تمہارا ۔ " میں نے کہا ۔

" فرصت نہ ہوئی ، پھر سوچا جانے آپ کو فرصت ہوگی یا نہیں ۔ " گلو میاں کے سانولے چہرے پر شکایت بڑی معصوم معلوم ہوئی ۔

" ارے واہ ، جیسے غیر ہو تم تو ۔ " میں نے ذرا ٹھنک کر تلافی کرنا چاہی واقعی اس پہلی ملاقات پر میں بے حد اپنے خول میں رہی ۔ اور گلو میاں اب شاید پہچاننے لگے تھے ایسی باتوں کو ۔

بہر حال بھائی جان نے ان کی اماں اور بہن وغیرہ کو پوچھ کر گلو میاں کا خلوص دوبارہ جیت لیا ـــ معلوم ہوا کہ نمائش میں جھونپڑی ڈالے پڑے ہیں ، باقی سب خیریت ہے ۔ بھائی نے روزگار کا پوچھا تو ۔ بہت چہک کر بولے ـــ " الاٹمنٹ میں انسپکٹر ہو گیا ہوں ۔ " ان کا یوں عام فہم انداز میں کہنا لطف دے گیا ۔ پھر ہم لوگ انہیں اپنے فلیٹ پر لائے ـــ ، اماں ہمیشہ کی طرح لکھنؤ والوں کو دیکھ کر وطن کی یاد میں رونے لگیں ، اور گلو میاں ایسی محبت سے ان کے گلے لگ کر ساتھ روئے کہ میری آنکھیں بھی بھر آئیں ۔ حالانکہ مجھے لکھنؤ کبھی یوں یاد نہ آیا کہ رو سکوں ۔

ایک پیالی چائے کے بعد ، گلو میاں نے وعدہ کیا کہ وہ ہم لوگوں کو آئندہ اتوار کو اپنے ہاں لے جائیں گے ـــ سو ہم لوگ اپنی نئی زندگی اپنے اوپر اوڑھ کر وہاں گئے ۔ گلو میاں

ہمیں گھر میں یوں لے گئے جیسے بڑی قیمتی چیزیں ہوں ہم سب ، چھوٹے سے قطع زمین کو کھجور کی چٹائیوں سے گھیر کر دو کمرے سے اور ایک آنگن سا بنالیا گیا تھا باھر بڑی شان سے گلو میاں کے پورے نام اور عہدے کی تختی لگی ہوئی تھی - ان کی اماں بے چاری کو زمانے نے بہت چمکا دیا تھا ، مگر اس کے باوجود ان کے کپڑے صاف تھے - اور اس گھر کی ہر چیز سے سلیقہ اور شائستگی ٹپکتی تھی گلو میاں کی بہن زہرا پہلے کی نسبت زیادہ دبلی اور زرد ہو گئی تھی ، مگر اس نے اپنے تعلیم یافتہ ہونے کے ثبوت میں دو چوٹیاں کس کر گوندھ رکھی تھیں جس کی وجہ سے اس کا چہرہ اور بھی



پتلا اور زرد معلوم ہو رہا تھا - جب ہم لوگ دھلی ہوئی براق چاندنی پر بیٹھ کر پرانے چینی کے خوبصورت سیٹ میں چائے پینے لگے تو میں نے دیکھا کہ زہرا پکوڑوں پر چٹنی ڈال کر بڑی نفاست سے چمچے کے ساتھ ذرا ذرا سا منہ کھول کر پکوڑے کھا سکتی تھی - ان کی اماں کافی خوش اور مطمئن نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی ، اور بار بار بتا رہی تھیں کہ یہاں جھونپڑیوں میں بڑے بڑے امیر لوگ رہتے ہیں - کئی تو ان میں موٹر اور موٹر سائیکل والے ہیں ـــــ مگر ہم لوگ ان سے ہمدردی کرنے سے نہ چوکے انہیں دیکھ کر بار بار ان کے میاں کے زمانے کی کئی باتیں دل پر اچھل اچھل کر جو لگتی تھیں - شاید اگر وہ اپنا دکھ روتی تو ہمارا یہ رد عمل نہ ہوتا ، مگر وہ صاف پہلو بچا جاتیں - لیکن

گلو میاں اتنے سیدھے کہ ہاتھ پھیلا پھیلا کر ہماری ساری کمینی ہمدردیاں دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے رہے۔

"اے ہے کیا وقت پڑا ہے بھائی آپ پر بھی وہ لکھنؤ کا زمانہ یاد آتا ہے۔" اماں ایک ٹھنڈی سانس لیکر بولیں۔

"ہاں۔ مگر گلو میاں کو خدا سلامت رکھے، ان کے افسر جو ہیں، وہ ان کے ابا کے ہاتھ تلے کام کر چکے ہیں بڑا لحاظ کرتے ہیں، بڑی عزت ہے۔ پھر ان کی تنخواہ ہی نہیں ہے ماشاءاللہ سے خان صاحب کے وقتوں کی کمائی بہن چکتے چکتے چکے گی۔" گلو میاں کی اماں اپنے سونے کے کرن پھول جھمکے سر کے جھٹکے سے جھلا کر بڑی پر اسرار مسکراہٹ سے بولیں۔

"مگر اماں یہ آپ کے چند زیور تو بھیا کے نئے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں انسان اپنی قوت بازو پر ایمان رکھے۔ اب دیکھئے ہم جو کرانچی آئے تو نہ پیسہ نہ نوکری۔ اللہ کا نام لیکر دفتروں کی خاک چھاننا شروع کی تو آخر مل گئی نا نوکری۔ شبو بھائی کہتے تھے اماں یار اکڑخوں میں کرانچی چلے ہو واللہ الٹے پاؤں آؤگے۔ مگر دیکھئے جس اللہ نے منہ چیرا ہے کھانے کو بھی دیتا ہے۔ نیت چاہیئے نیک، شبو میاں کی طرح تھوڑی کہ۔" گلو میاں کہتے کہتے رک گئے کیونکہ ان کی اماں گھر کے راز افشا ہوتے دیکھ کر انہیں گھور رہی تھی"

"زہرا تم نوکری کرلو کسی سکول میں۔ تعلیم کس کام آئے گی۔" بھائی جان نے زہرا کی طرف دیکھے بغیر مشورہ دیا۔

زہرا کے چہرے کا رنگ سفید ہوگیا —— اور گلو میاں دوبارہ بولنے لگے۔ "کیوں جب تک میں زندہ ہوں بہن کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے، ابا نے انہیں اس خیال سے تھوڑی پڑھایا تھا" گلو میاں کا چہرہ جوش سے گہرا سانولا ہوگیا —— اور ہونٹ کانپنے لگے جیسے بھائی جان نے انہیں گالی دی ہو —— بھائی جان نے کافی صفائی کی اور بتایا کہ وہ عورتوں کی مساوات کے کس قدر قائل ہیں۔ مگر گلو میاں اڑے رہے۔

"ہم چٹنی روٹی کھاتے ہیں آخر مہینے میں مگر بھیا بھلا نوکری کیوں کریں ——" گلو میاں کہے گئے اور ان کی اماں کا چہرہ ست ہوگیا —— وہ حسرت سے گلو میاں کی طرف

دیکھتی رہیں - جو ان سے اور ہم سے سب سے الگ تھے - جیسے نازک کانچ کے برتنوں کے درمیان پرانے دکھنی پہاڑوں میں سے نکلا ہوا پتھر کا ایک سیاہ ٹکڑا - ٹھوس ، مضبوط اور نہ بدلنے والا ---

دل کے ایک گوشے میں گلو میاں مجھے کچھ بڑے سے لگے -

گلو میاں جو بھی تھے سچے تھے --- وہ چھوٹے ہی تھے کہ ان کے ابا چل بسے - وہ رکھ رکھاو ، وہ دوسروں سے چھپا کر تکلیف اٹھانا ، دوسروں کو مرعوب کرنا اور اوپر کی طرف لپکنا گلو میاں نے سمجھا ہی نہ تھا غالباً --- جب انہیں سمجھ آئی تو کھانے کی میز سجی پڑی رہتی - گلدان میں نیم کی ٹہنیاں روز زہرا بدلتی لیکن کرسیوں پر شبو میاں کی دلہن اپنے ننھے کے پوتڑے ضرور سکھاتیں اور سب باورچی خانے میں گھس کر گنی ہوئی چپاتیاں برائے نام بگھاری ہوئی دال اور پودینے کی چٹنی سے چپڑ کر اکڑوں بیٹھ کر کھا لیتے --- ان کی اماں جان جل کر کہا کرتیں ، بہو کو سنانے کے لئے کہ " اے بس یہیں کھا لو ، کون سے پلاؤ قورمے کھانا ہیں جو میز کرسی پر بیٹھا جائے - خوامخواہ میز پوش میلا کرنے سے کیا حاصل ؟ " --- لیکن جب گھر میں کوئی رشتے دار پہنچ جاتا تو ارھر کی کھچڑی بھی چینی کی قاب میں سجائی جاتی اور میز پر رکھ کر کھائی جاتی اور آنے والے پر بار بار یہ جتایا جاتا کہ واہ ! ارھر کی کھچڑی جب تک ہفتے میں دو بار نہ کھائی جائے زندگی کا لطف ہی کیا ؟ --- مگر یہ دورخاپن گلو میاں پر سے اوپر ہی اوپر سے نکل گیا - انہیں تو معلوم تھا کہ شبو بھائی کی تنخواہ تھوڑی ہے اور ان کے ہاں بچے ہر سال ہرتے ہیں - بھابھی ہمیشہ قسمت کو روتی ہیں - اماں اور بہن جو اندھیری کوٹھریوں میں چھپ چھپ کر روتی ہیں تو یوں ہی تفریحاً نہیں - وہ انہی حقیقتوں کے پروردہ تھے - ان کی یہ سادگی یہ کھراپن مجھے یوں ہی سا بھلا معلوم ہوتا - ویسے بھی وہ مجھ سے اس قدر مرعوب رہتے کہ ان کی آمد سے مجھے اپنی شخصیت کی تکمیل ہوتی محسوس ہوتی - جب وہ اتوار اتوار ہمارے ہاں آتے تو اور سب چاہے بور ہو کر الگ جا بیٹھیں مگر میں ان سے گپ شپ میں لگی رہتی - اماں نے کئی بار کہا

کہ " دیکھو گلو میاں کو اتنا منہ نہ لگاؤ ۔ کل کہیں یہ چاہیں کہ تمہارا بھائی ان کی بہن کو سمیٹ لے ۔ نہ بھئی ماشاءاللہ سے تمہارا بھائی پروفیسر ہے اچھی سے اچھی دولت مند لڑکی مل جائے گی اسے ۔ "

اماں کے اس گھٹیا انداز پر میں چڑ جاتی اور گلو میاں کے گھرانے کی حمایت کرنے لگتی ۔ لیکن جب میں ٹھنڈی پڑ کر سوچتی کہ آخر گلو میاں کی آمد پر میں اپنا وقت کیوں ضائع کرتی ہوں اس کے بجائے بیٹھ کر منشی فاضل کا کورس کیوں نہیں رٹتی ؟ تو بات وھی شخصیت کی تکمیل والی نکلتی ۔ گلو سے بڑے اعتماد کے ساتھ مختلف چیزوں پر بحث کر کے اور اسے قائل کر کے مجھے ایک عجیب سی تسکین ھوتی ۔ جیسے میں بہت اونچی ھوں ، بہت ھی اونچی ——— وہ میری باتیں اتنی عقیدت سے سنتے کہ مجھے ایک نشہ سا محسوس ھوتا ۔ بھائی جان تو میرا ذرا کم ھی نوٹس لیتے اور اماں کے دلائل کے آگے میری خاک نہ چلتی مگر گلو میاں مجھے دنیا جہان کا فاضل سمجھتے ۔ وہ ذرا ذرا سی بات میں میرا مشورہ لیتے حتیٰ کہ اپنے دفتر کے جھگڑوں میں بھی میری اوٹ پٹانگ رائے پر عمل کرتے ۔ اور مجھے یوں معلوم ھوتا جیسے میں سادگی کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں منارۂ نور بن کر استادہ ھوں ۔

لیکن اس دن وہ فقیر کالے دبلے پتلے سے گلو میاں (جنہیں ھم آپس میں غیر اھم ثابت کرنے کے لئے محض گلو کے نام سے یاد کرتے تھے) جیسے اپنی کمزور ٹانگوں پر لڑکھڑا کر ایک دم میرے حواس پر کھڑے ھو گئے ۔

" آں گلو میاں ۔ "

میں منشی فاضل کے کورس کی دیوار کا سہارا لیکر بمشکل آواز نکال سکی ۔ میں نے انہیں آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھا ۔ وہ گلو میاں ھیں یا کوئی اور ۔ مگر یہ وھی تھے وھی سرمئی سرج کی شیروانی جسے لکھنؤ میں شبو میاں پہنا کرتے تھے اور جو اب آخری دموں پر تھی ۔ وھی دبلا پتلا گہرا سانولا لڑکا جس کی کھال تلے زردی بڑی صفائی سے جھلک مارتی (جسے دیکھ کر کئی بار مجھے مینڈک کا خیال آیا تھا) خوب گھنے گھنگریالے بال جن میں شاد ھی تیل ڈالا جاتا ۔ وہ اس طرح میری بے ڈھنگی میز کے

دوسری طرف منشی فاضل کے نصاب کی دیوار کے پیچھے بیٹھے تھے - یعنی گلو میاں ! بڑے مطمئن ، بڑے نازاں بڑے پراعتماد - مجھے یوں لگا جیسے میری گود سے کوئی ننھا سا بچہ اتر کر فلیٹ کی سیڑھیاں طے کر کے سڑک پر چل دیا ھے -

بڑی دیر کی بے تکی خاموشی کے بعد میں نے گلے سے کوئی نامعلوم شے اتار کر صرف اتنا ھی کہا - " سچ ، گلو میاں ، آں ؟ "

" ارے تو کیا جھوٹ بٹو آپا ، دیکھئے نا - " اس نے انگلی اٹھا کر مجھے سمجھایا -

" اپنی قوت بازو پر اعتماد کرنا چاھئے - "

میں اس کے اعتماد سے بجھ گئی - میرا جی چاھا کتابیں اٹھا کر پٹخ دوں مجھے خیال آیا کہ اب تک گلو میاں جس عقیدت کا اظہار مجھ سے کرتے تھے وہ محض بناوٹ تھی - ورنہ یہ قصہ اتنے دن سے چل رہا تھا مجھ سے ذکر تو کیا ھوتا - میں چپ رہ گئی -

" دیکھئے نا بٹو آپا وہ بے چاری عورت تھی - پھر ایمان سب سے بڑی دولت ھے نا ، وہ میرے انکار پر بڑی حیران ھوئی ، اسنے مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا ، چائے پلائی اور کہنے لگی کہ انسپکٹر صاحب آپ بہت نیک آدمی ھیں - ھمارے گھر آیا کرو - اللہ قسم بٹو آپا اس کا ڈرائینگ روم اتنا بڑا تھا اتنا شاندار جیسے فلموں میں ھوتا ھے نا - " گلو میاں نے مجھے بتانا شروع کیا تو جھٹ میں نے اُن کی بات کاٹی اور جلدی سے اپنی رائے دینا شروع کردی -

" مگر گلو میاں ، دیکھو نا ، کیا حماقت تھی ، جب لاکھوں کے سودے میں سے پانچ ھزار مل رھے تو چھوڑے کیوں - دنیا کا دھندا تو یوں ھی چلتا ھے ، پھر تمہارے حالات - مجھ سے مشورہ کیا ھوتا - "

" بخدا واللہ یہ بھی کوئی مشورہ کرنے کی بات تھی ، یہ تو میں خود بھی جانتا ھوں کہ نیکی کیا ھے اور بدی کیا ھے - اچھا اب میں چلوں فاطمہ بائی کے گھر کھانے پر جانا ھے " یہ کہہ کر گلو میاں ایک دم یوں دروازے کی طرف بڑھے کہ میں کھلے دروازے میں ان کی بوسیدہ شیروانی کی پھڑ پھڑاھٹ سن سکی -

مجھے دکھ ہوا کہ میں نے جلدی میں غلط بات کہہ ڈالی۔ پھر بھی غصہ تھا۔ گلو میاں کے خلاف غصہ۔ میں یہ بات کیسے مان لیتی کہ پانچ ہزار روپیہ گلو میاں کے لئے اتنا غیر اہم ہو سکتا تھا جو انہیں ایک جائز رپورٹ دینے کے صلے میں مل رہے تھے۔ ایک گھٹیا سے انسپکٹر کے لئے جس کی بہن کنواری تھی۔ یقیناً ان پانچ ہزار روپوں کے جہیز پر میری اماں بھی زہرا کو بہو کے طور پر قبول کر لیتی --- پانچ ہزار میں مکان بھی تو بن سکتا تھا --- پانچ ہزار۔ پانچ ہزار! یہ پانچ ہزار روپے کھنکھنا کھنکھنا کر میرے سامنے گر رہے تھے، جن کی دھار کے پیچھے رنگین ساڑیاں، زیور اور ہزاروں ضروریات تھیں۔ پھر ان سب سے پرے منہ پھیرے گلو میاں بیٹھے تھے --- وہ گلو میاں جنہیں بڑھتے قد و قامت کے زمانے میں چپاتیاں گن کر کھانے کو ملتیں اور جن کا گلاسوں پانی پی جانا خاندان بھر میں مشہور تھا --- مجھے رہ رہ کر دکھ ہو رہا تھا کہ گلو میاں نے کیا حماقت کی کوئی اور ہوتا تو یہ روپے لے لیتا --- شاید میں بھی --- مگر نہیں میں تو نہ لیتی --- مگو گلو میاں سے خلوص کی بنا پر اسے یہ روپے لے لینے کا مشورہ ضرور دیتی --- مگر انہیں تو میرے مشورے کی ضرورت نہیں رہی --- بڑے آئے بقراط بن کر۔ احمق تو دھرے ہیں بالکل ---

مگر رات جب میں سوئی تو گلو میاں کے ساتھ جانے کہاں سے خوابوں میں روشنی کا تصور وابستہ ہو گیا۔ ایک بار میں نے دیکھا ان کے گھنے بالوں میں جگنو ہی جگنو ہیں --- دوسری بار یوں کہ ان کے گرد چنگاریاں سی اڑ رہی ہیں --- میں اچھل اچھل پڑی --- میں تو گلو میاں کو محض گلو سمجھنا چاہتی تھی، یہ روشنی وغیرہ اس کے حصے میں دیکھنا میرے بس کا روگ نہ تھا۔

اس قصے کے چند روز بعد جو پہلی اتوار آئی تو گلو میاں سویرے سویرے موجود، بڑے ہولائے ہوئے گھبرائے، مگر خلاف معمول منہ نہایت احتیاط سے دھلا ہوا اور بال خوب احتطاط سے جمے ہوئے۔ میں باورچی خانے میں بیٹھی چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتار رہی تھی کہ انہوں نے بڑے بھونڈے پن سے مجھے الگ

کمرے میں چلنے کا اشارا کیا اور مجھے ان کی آنکھوں میں عجب قسم کی چکناہٹ سی نظر آئی جس سے جی اوب گیا، پھر بھی میں اپنے کمرے میں آگئی۔ انھوں نے بڑی تفصیل سے ایک بات بتائی۔ اور وہ کل یہ تھی کہ فاطمہ بائی نے ان کی نیکی اور شرافت کو پسند کیا تو کیا کیا، اس کی بیٹی شیریں بھی ان سے محبت کرنے لگی ہے۔ اور شیریں نے انہیں خط لکھا ہے کہ میں تو تمہیں سے شادی کروں گی، تم دولت کو کچھ نہیں سمجھتے، میری برادری والے دولت مند ہیں مگر وہ مجھ سے دولت کی وجہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر تم ---

یہ چکنا چکنا گیلا گیلا قصہ سن کر مجھے ذرا یقین نہ آیا --- میں نے جل کر کہا۔ " تو پھر اس کے بعد تمہاری آنکھ کھل گئی، کیوں؟ "

" واللہ آپ تو۔ واہ۔ " گلو میاں نے جیسے چوٹ بچائی اور پھر ایک دم ان کا چہرہ عنابی ہو گیا۔ وہ ایک منٹ رکے بغیر چلے گئے۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ انہیں خفا دیکھا تھا۔ مجھے ان پر رحم آگیا۔

گھر میں سب ان کے آنے اور پھر ایک دم چلے جانے پر حیران ہوئے۔ میں نے یہ بتا دینا مناسب سمجھا کہ بیوقوف لڑکا کراچی آکر کس طرح دولت پھٹ پڑنے کے خواب دیکھنے لگا ہے۔ بڑے قہقہے پڑے۔ بھائی جان جو نفسیات کے لکچرر ہیں۔ بولے۔ " وہ پانچ ہزار والا قصہ بھی اہمیت حاصل کرنے کو گھڑا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے یہ گلو میاں فالتو اوقات میں ابھی تک بچوں کے رسالے پڑھتا ہے جبھی تو نیکی اور نیکی کے اجر کے خواب دیکھ رہا ہے بٹو! میرا خیال ہے یہ گلو تمہارے بارے میں سوچنے لگا ہے۔ بہتر ہے تم اسے منہ لگانا چھوڑ دو۔ "

" واہ بھائی جان خوامخواہ --- " میں ایک دم جھینپ گئی۔ لیکن دل میں سوچا شاید، شاید۔ اور مجھے اس خیال سے ہی اپنی ہتک کا احساس ہوا۔ میں نے سوچا اب میں اس آلو گلو سے بات بھی نہ کروں گی۔

لیکن مجھے یہ فخر حاصل کرنے کا موقعہ عرصے تک نہ مل سکا کیونکہ اس دن کے بعد گلو میاں ہمارے ہاں نہیں آئے۔ بعد

میں آئے تو ان کی شادی کے سنہرے چھپے ہوئے دعوت نامے ـــ گلو میاں سچ کہتے تھے۔

پہلے تو ہم سب سناٹے میں آگئے اس کے بعد اماں نے بڑے دھیمے لہجے میں ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ " اللہ کرانچی میں تو ہر چیز کا مول ہے۔ میرے بچوں کی بھی قسمت کھولیو۔"

" ہنہ " بھائی جان سگریٹ سلگاتے اپنے کمرے میں چلے گئے، میں اپنے صندوق پر جھک کر سوچنے لگی کہ اس موقع پر کیا پہنوں گی آخر بڑے گھر میں دولہا کی بہن بن کر جانا ہے اور پھر الجھن میں میری آنکھیں پر آب ہو گئیں۔

ہم سب دولہا کے عزیزوں کی حیثیت سے بارات میں گئے۔ بارات اتنی شاندار تھی کہ ہمیں یقین آ گیا کہ گلو کے ابا ضرور کوئی قارون کا خزانہ چھوڑ مرے تھے۔ گلو کی اماں شیخی بگھار کر مری جا رہی تھیں۔

" اے بہن تمہیں مبارک، تمہارے بھتیجے کا کیا جوڑ سے جوڑ ملا ہے۔ شکر ہے خدا کا، برا چاہنے والوں کے منہ میں خاک۔ آؤ بہن آؤ بری دیکھو کوئی کسر تو نہیں رہ گئی تم تو ہمارا خون ہو، ہمارا بھلا دیکھ کر خوش ہونے والوں میں۔" گلو کی اماں میری اماں کے گلے سے لگ کر ریکارڈ کی طرح بجنے لگیں۔

اور میری اماں بیچاری کھسیا کر دعائیں دینے لگیں۔ اس کے بعد ایسی اپنائیت سے بری کا سامان دیکھنے لگیں کہ اگر کوئی کسر رہ گئی تو واقعی خود ان کی سبکی ہوجائے گی ـــ اس سے فرصت پاکر جلدی سے بھائی جان کو دروازے پر بلایا اور چلا چلا کر کہنے لگیں ـــ " بیٹا جلدی سے گلو میاں کے پاس جاؤ اور دیکھو شہ بالا تم ہی بننا تمہارا ہی حق ـــ "

پھر جب اماں پلٹیں تو گلو کی زرد رو بہن زہرہ کو میری بچی کہہ کر گلے سے لگا لیا ـــ

واقعی بڑے ٹھاٹ کی بری تھی۔ ایسے ایسے کپڑے اور زیور کہ آنکھیں چوندھیا گئیں ـــ ہماری حیرت اور ندامت دیکھ دیکھ کر گلو کی اماں برابر اپنی سلیقہ شعاری اور روپیہ بچا بچا کر رکھنے کے تذکرے کرتی رہیں۔ کراچی میں جتنے بھی دور قریب

کے عزیز اور شناسا تھے وہ سبھی مہمان تھے اور سب پانی پانی —— کئی عورتیں اس بات پر حیران تھیں کہ اب تک ان کی عقل کہاں چرنے چلی گئی تھی جو گلو میاں چلے گئے غیر ذات برادری والوں کے داماد بن کر —— اے ان لوگوں نے فقطا جان کر تو شادی کی نہیں ہوگی۔

مگر جب بھائی کے ساتھ دولہا کی کار میں میں بھی گھس پڑی اور مرعوب ہوکر گلو میاں کے چہرے کی طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ہائے گلو میاں اچھے بھلے نمکین سے تو ہیں، بچپن میں کئی بار میں ان کی جھوٹ موٹ کی دلہن بھی تو بنی تھی۔

" کیوں گل بھیا تم نے ہمیں غیروں کی طرح عین شادی کے دن بلایا۔ بیچاری ممانی نے اکیلے کیسے اتنے انتظامات کئے ہونگے۔" میں نے ہونٹ لٹکا کر کہا۔

" ارے نہیں بٹو آپا یہ سب تیاریاں کوئی اماں نے کی ہیں؟ سارا سامان تو میری ساس نے بھجوایا ہے۔ میں نے تو کہہ دیا تھا کہ میں آپ کی شان کے مطابق کچھ نہ کر سکوں گا۔ تو انہوں نے کہا۔ ہم سب سامان پہلے بھیج دیں گے تمہارے گھر تم وہ ساتھ لے آنا —— سچ مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں۔ میں تو غریب ہوں غریبوں کی طرح بیاہنے آؤں گا۔ مگر انہوں نے میرے آگے ہاتھ جوڑے کہ ہماری برادری والے ویسے ہی غیر لوگوں میں شادی کے سخت خلاف ہیں بہت کم برادری والے شامل ہوں گے، وہ بھی اس لئے کہ تم گھر داماد ہونے والے ہو۔ یہ چیزیں ہم اپنی بیٹی کو دیتے ہیں — تمہیں کیا اعتراض —— ہماری عزت رکھ لو —— پھر میں نے بات مان لی —— ٹھیک کیا نا بٹو آپا؟ —"

میں نے پھر گلو میاں کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے پھولوں میں لدے بڑے کالے نظر آئے۔

ایک نہایت شاندار کوٹھی میں، ایک نہایت شاندار بینڈ کی موسیقی میں، گلو میاں کی شادی کی رسم ادا ہو گئی نکاح نامے میں یہ شرط تھی کہ دولہا دلہن کو اس کے گھر سے نہیں لے جاسکے گا اور خود دلہن کے گھر رہے گا۔ سلامی میں

گلو میاں کو گیارہ ھزار روپے پیش کئے گئے جو انھوں نے قبول نہیں کئے ۔ فاطمہ بائی جو بمبئی کے ایک تاجر کی بیوہ تھی اپنے قومی لباس میں بڑے وقار سے مہمانوں کی خاطر مدارت کرتی رھی ۔

شیریں موٹی سی ناک، مٹیالے سے رنگ اور معصوم بڑی بڑی آنکھوں والی چوبیس پچیس سال کی نازک سی لڑکی تھی یقیناً گلو میاں سے عمر میں چند سال بڑی ۔ وہ دلہن کے لباس میں بیٹھی یوں پلکیں جھپکا رھی تھی جیسے گڑیا ھو، اور پلک جھپکانے کے عمل میں اس کا اپنا کوئی دخل نہ ھو ۔ میں اس لڑکی کو اتنا بے جان دیکھ کر حیران رہ گئی ۔ بے شمار جہیز میں اسکے لئے پچاس جوڑے سینڈلیں تھیں ۔ مجھے خیال آیا کہ کیا وہ اتنی دیر چل سکے گی کہ اس کی ایک ھی سینڈل کا تلا گھس سکے ۔

" تو پھر گل بھیا اللہ نے چھپر پھاڑ کر دولت دیدی تمہیں ۔ اب تو مزے ھیں تمہارے ۔ " میرے بھائی جان نے خشک ھونٹوں پر زبان پھیرتے ھوئے ذرا کھسیا کر کہا ۔

" اللہ کی مہربانی ھے، مگر بھائی جان میں نے تو اپنی ساس سے کہہ دیا ھے کہ میں اپنی نوکری کرتا رھوں گا ۔ آخر میری اماں ھیں بہن ھیں ۔ یہ سب میری بیوی کا ھے ۔ مجھے اس سے کیا غرض ؟ "

گلو میاں نے بڑی احتیاط سے اپنے قیمتی سوٹ پر نظر ڈالتے ھوئے جواب دیا ۔

اور میرے بھائی جان یوں ھنسے جیسے گدھے کو خشک کھاتے دیکھ رھے ھوں ۔

" لیکن گل بھیا یہ کیسے ھو گا ؟ کیا تمہاری اماں اور بہن تمہارے ساتھ نہیں رھیں گی، تم تو گھر داماد ھو نا ۔ " میں نے گھبرا کر پوچھا ۔

" رھیں گی میرے ساتھ لیکن کھائیں گی میری کمائی، دیکھئے نا میں کون سا کم ھوں اپنوں کی خدمت کو ۔ اللہ کے فضل سے نوکر ھوں ۔ میں نہیں چاھتا کہ میرے گھر والے کسی اور کا دیا کھائیں ۔ میں نے صاف کہہ دیا اپنی ساس سے برا مانیں تو

مانتی رهیں ۔ " گلو میاں نے بڑے عزم سے چھاتی پھلا کر کہا ۔ اور میں نے تکان سے جمائی لیکر سوچا اب گھر چلنا چاهئے کھانا تو هو چکا ۔

میری اماں کھا کھا کر ناک تک ڈٹی هوئی تهیں ، واپس آتے هوئے راستے میں بڑبڑائیں ۔ " هے ! یه فاطمه بائی نگوڑی کچھ دیوانی لگتی هے دنیا جهان میں یهی ایک گلو ملا تها داماد بنانے کو ۔ نه صورت ، نه شکل ، نه علم ۔ مگر میں کهتی هوں قسمت دیکھو ۔ کرانچی بهی خوب جگه هے بهئی واه ۔ ۔ ۔ "

کئی دن تک همارے رشتے داروں اور ملاقاتیوں میں اس شادی کے چرچے رهے کوئی کچھ کهتا ، کوئی کچھ ، مگر سب کی متفقه رائے یه تهی که گلو میاں اپنی حماقت میں دریا میں غوطه لگانے کے باوجود سوکھے کے سوکھے رهیں گے ۔

میرے بهائی جان کهتے که بهلا یه کیا تک تها که جناب نے سلامی لینے سے انکار کیا ، حالانکه سلامی تو هر غریب امیر دولها قبول کرتا هے — محض جوش حماقت اور کچھ نهیں — ارے داماد کهیں یوں مفت ملتے هیں ؟

اس کے باوجود هم سب دریائے حماقت میں غوطه لگانے کو بے چین رهتے ، یعنی گلو میاں سے ملنے جلنے کو بے قرار — هم لوگ اپنی پڑوسنوں سے ناک بهوؤں چڑھا کر فاطمه بائی سے اپنی رشتے داری کا ذکر کرتے ، اماں کهتیں اے همارا لڑکا ایسے کھرے خاندان کا ، غیروں میں جا کر پهنس گیا ۔ بهائی جان اپنے دوستوں میں اسی طرح کی باتیں کرتے لیکن اکثر شاموں کو همارا منه اٹھتا تو سیدھے گلو میاں کی سسرال جا پهنچتے بڑی شاندار دو منزله کوٹھی تهی اوپر کی پوری منزل بیٹی داماد کے لئے مخصوص تهی اور نچلی منزل میں فاطمه بائی اور ان کے چند دور کے رشتے دار رهتے تهے — یه رشتے دار ان کی تجارت کے کاموں میں چھوٹی چھوٹی تنخواهوں پر لگے هوئے تهے — گھر میں بهی ان کی حیثیت یوں هی سی تهی — موقع ملتا تو یه رشتے دار مهمانوں کے سامنے چائے بهی لا کر لگا دیتے ۔ ان هی میں ایک چگی ڈاڑھی والا ادھیڑ عمر آدمی بهی تها جو گھر کے حساب کتاب کا نگراں مقرر تها مگر عام طور پر چائے کی

پیالیاں اٹھائے نظر آتا — ہم لوگ پہنچتے تو وہ ضرورت سے زیادہ ہماری مدارات کرتا ۔ ویسے فاطمہ بائی خود کچھ کم ہماری خاطر نہ کرتیں ۔ چائے کا وقت ہوتا تو چائے پلواتیں، باتوں میں دیر ہوجاتی تو کھانا کھلواتیں کھانا جس میں کچے ناریل کی بو ہوتی — گلو میاں کی اماں نے بھی بڑا رنگ نکالا تھا ۔ وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر بڑے ٹھسے سے بیٹھتیں ۔ اور میز پر بڑا سا پاندان کھلا رہتا — مگر لباس سے کئی بار یہ پاندان میل نہ کھاتا ۔ کیوں کہ وہ اکثر فاطمہ بائی کا قومی لباس بھی پہننے لگی تھیں ۔ کئی بار وہ ہم سے لڑکیوں کی طرح ٹھنک ٹھنک کر کہہ چکی تھیں کہ "اے کیا کروں ہماری سمدھن رات دن پیچھے پڑی رہتی ہیں کہ آج یہ پہنو کل وہ — انہیں اتنی محبت ہے ہم سے کہ سنتی ہی نہیں ۔"

یہ تعریفیں سن کر فاطمہ بائی بڑی نہال ہوتیں — گلو کی بہن بھی اب بولتیں تو اپنی بھابھی کی تعریف ہی میں ۔ میں نے کتنی بار دیکھا کہ شیریں کے جہیز کی سینڈلیں گلو کی بہن بڑی تیزی سے گھس گھس کر ٹھکانے لگا رہی ہیں — گلو میاں نوکری پر جاتے، پر ساس نے موٹر سائیکل خریدوا دی تھی، اس پر — موٹر پر اس لئے نہ جانے کہ انہیں شرم آتی تھی — میں دیکھتی بے چارے گلو میاں عجب ہونق سے رہتے ۔ جیسے غلط ڈھبری کسی گئی ہو ان کی ۔

شیریں اکثر ہمارے سامنے گلو میاں سے کہتی ۔ "یہ نوکری کیا ہے بزنس کریں گا تو اچھا ہوئینگا اپنا بزنس ہے، آسے دیکھیں گا ۔ موٹر اپنی چھوڑینگا اور موٹر سیکل پر گھومیں گا تو لوگ کیسا ہوئینگا ۔"

شیریں یہ سب اتنے مشینی انداز سے کہتی کہ جی الٹ جاتا ۔

"ارے ہاں گل بھائی ٹھیک تو کہتی ہیں بھابی، بزنس کی دیکھ بھال کیا کرو ۔" میں بالکل مفت مشورہ پیش کرتی ۔

"پر ہم کیا بولیں گا ۔ ہمارے کو اپنا نہیں سمجھیں گا گل بھائی ۔" فاطمہ بائی بھی شکایت کرتیں اور گلو میاں پنجرے میں بند بندر کی طرح حسرت سے ہم سب کو دیکھتے ۔ لیکن ہم سب پوری قوت سے فاطمہ بائی کی ہاں میں ہاں ملاتے ۔

اور ہم میں سے ہر شخص کے دل میں ہوتا کہ اگر ہم گلو میاں کی جگہ ہوتے تو ـــــ

پھر ایک دن سنا کہ گلو میاں نے، اپنے کسی افسر کی ڈانٹ پر اسے گھونسہ رسید کر دیا اور ملازمت چھوڑ دی ۔ اور یہ بھی سنا کہ اب فاطمہ بائی کی خواہش کے مطابق بزنس کی دیکھ بھال کرتے ہیں ۔

ہم سب موقع دیکھ کر پہنچے ۔ یقین جو نہیں آتا تھا ۔ مگر پتہ چلا ٹھیک ہے ۔ گلو کی اماں اور بہن بڑی نہال تھیں ۔ گلو میاں ذرا دیر بعد موٹر سے اتر کر اندر آئے تو کافی بدلے بدلے سے لگے، جیسے بیمار ہوں ۔ مگر مجھے یہ بیماری بڑی رومینٹک سی لگی، اور جب وہ دھیرے سے آٹھ کر کندھے جھکائے اوپر چلے گئے تو ان کی اماں نے ان کی اس ادا کا ترجمہ یوں کیا کہ " بچہ تھکا ہوا ہے، اب جا کر نہائے گا ـ "

" نہیں ناراض ہیں گا ہمارے سے، دیکھو ام بولا تھا گل بھائی، بزنس بزنس ہے، کسی کے ساتھ مروت نہیں کریں گا ـ ایک مہینہ ہوئیں گا تم کوئی نفع نہیں کمایا، ـ ام یہ بی بولا گل بھائی کسی پر روپیہ نہیں چھوڑیں گا، مروت اور روپیہ کا دشمنی ہے ۔ بزنس بزنس مافق ہوئینگا ۔ "

فاطمہ بائی نے اپنی مخصوص اردو میں ہمیں اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی ۔

" اے سمدھن خوامخواہ سمجھتی ہو لڑکا ناراض ہو گیا ۔ بچہ نرم دل ہے ۔ سیکھتے سیکھتے سب سیکھ جائے گا ۔ " گلو کی اماں نے زور سے پاندان بند کیا ۔

" نہیں آپا بزنس بزنس ہے ـ نہیں تو سب کھلاس (ختم) ہو جائینگا ابراھیم بھائی بولتا گل بھائی بوھت مروت کرتا ۔ "

" بالکل ٹھیک بولا، بالکل ٹھیک ۔ " ابراھیم بھائی نے اپنی چگی ڈاڑھی ہلا کر ہمارے سامنے چائے پیش کرتے ہوئے کہا ۔

اس گھریلو کاروباری کھنچاؤ پر کافی دیر گفتگو ہوتی رہی ۔ جس میں سب سے زیادہ میرے بھائی جان نے حصہ لیا اور اماں نے ہاں میں ہاں ملائی اور یہ ثابت کیا کہ گویا ان کے سوا

بزنس کے اصول اور کوئی نہیں جانتا ۔ گلو کی اماں بہت برا مانتی رہیں اور ثابت کرتی رہیں کہ ان کے تو خون میں کاروبار رچا ہوا ہے ، حالانکہ نرا جھوٹ تھا ، ان کے خانداں میں تو کسی نے ترازو تک کو ھاتھ نہ لگایا تھا ۔

واپسی سے پہلے ہم لوگ گلو میاں سے ملنے ان کی شاندار خوابگاہ میں پہنچے --- وہ بڑے بے چین سے تھے ، ہم نے انھیں بڑی اپنائیت سے "بڑا آدمی" ہو جانے کے طعنے دیئے اور شکایت کی کہ وہ ہمارے ھاں نہیں آتے ۔

"ارے کیا ، کہاں کی بڑائی ۔ یہ بزنس بھی نوکری سمجھ کے کر رھا ھوں ، آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا ھی ھے ، مرد ھوں ، مفت کی تو نہیں کھا سکتا --- ، خیر آئیے آپ لوگوں کو موٹر میں آپ کے گھر چھوڑ دوں ۔"

موٹر ڈرائیو کرتے ہوئے گلو میاں اجنبی لگے ۔ کیا بتاؤں --- گھر پر میں نے زبردستی انھیں بھی تھوڑی دیر کو اتار لیا --- مگر پھر شرم آئی کہ گھر کیا بری حالت میں تھا اس وقت ۔

گلو کی اماں ہم لوگوں سے کافی کھٹک گئی تھیں اس لئے ، انھوں نے ھمیں عرصے تک نہیں بلایا ، اور ھمیں بھی جانے کا موقعہ نہ ملا ۔

چند ماہ بعد یہ سن کر کوئی حیرت نہیں ھوئی کہ گلو میاں کاروباری معاملات میں بالکل نکمے ثابت ھوئے اور گلو میاں پر چگی ڈاڑھی والے ابراھیم بھائی نگراں مقرر ھوگئے ۔ اب سارے کام خود بخود ھوجاتے اس لئے گلو میاں بے چارے بڑے بڑے ھوٹلوں اور سنیماؤں میں پائے جاتے ۔ کبھی کاروبار میں دخل دینے پہنچتے تو ابراھیم بھائی بڑی محبت سے انھیں "سب ٹھیک چلتا ھے" کہکر چائے پیش کرتے ، اور سر جھکا کر انھیں رخصت کر دیتے --- یہ قصے سن سن کر میں گلو میاں سے ملنے کو بے چین تھی ۔ مگر اماں ذرا خودار زیادہ ھوگئی تھیں ، اس لئے فاطمہ بائی کے ھاں جانے کا موقع نہ مل سکا ۔

پھر ایک دن ھوا یہ کہ ھماری میلی کچیلی بلڈنگ کے سامنے ایک دن بڑی سی موٹر کا ھارن دیر تک بجا ، میں نے گیلری سے جھک کر دیکھا تو گلو میاں کی موٹر کھڑی تھی ۔

"گلو میاں آئے ہیں۔" میں نے چیخ کر اماں کو اطلاع دی۔ ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے جلدی جلدی کمرے میں بکھرے ہوئے کپڑے، میلے برتن اور کتابیں اٹھا کر دوسرے کمرے میں پھینکیں، کرسیوں پر جمی ہوئی دھول دوپٹے سے پونچھی۔ اماں نے دوسرے کمرے میں جا کر صاف دوپٹہ سر پر ڈالا، میں نے پھرتی سے ٹوٹی ہوئی چپل اتار کر سینڈل پہنی اور جب دروازہ کھولا تو گلو میاں کوٹ میں گلاب کا پھول لگائے بڑی سنجیدگی سے اندر آئے۔ مجھے یوں لگا جیسے گلو میاں کے چہرے پر عمر برس گئی ہو۔

اماں گلو میاں کی بلائیں لینے کے بعد چائے کے بہانے دوسرے کمرے میں گئیں اور پھر پچھلا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ظاہر ہے اماں پڑوسن کے ہاں سے اس کے جہیز کا ٹی سیٹ لینے گئیں تھیں، اور ساتھ اسے یہ بھی بتانے کہ دیکھو میرے سگے دیور کا لڑکا، جس کی قطعی ذاتی کار نیچے گلی میں کھڑی ہے،۔

"گل کتنے دنوں بعد آئے ہو، جاؤ ہم نہیں بولتے تم سے۔" میں نے محسوس کیا کہ میرے لہجے میں بڑی مرعوبیت تھی، اور دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

"فرصت ہی نہیں ہوتی کیا کروں بٹو آپا۔" گلو میاں نے بڑی مصنوعی سی تہذیب سے مسکرا کر کہا۔ اور مجھے لگا کہ کمرے میں کچھ سپرٹ سے ملتی جلتی بو پھیل گئی۔

"ارے گل کون سی اینٹیں ڈھوتے ہو، اللہ کی مہربانی سے کسی کے غلام نہیں۔" میں نے چکراتے ہوئے کہا اور گلو کو غور سے دیکھا، منشی فاضل کے کورس کی کتابوں کے پیچھے وہ کتنے مختلف نظر آئے۔

"سچ فرصت نہیں ملتی، کئی بار سوچا کہ آپ کے ہاں آؤں پھر بھول گیا، جانے کیا ہوگیا ہے دماغ کو۔" شادی کے بعد پہلی بار میں نے ان کے چہرے پر پرانی بے بسی دیکھی، اور میرا جی چاہا کہ اپنی کتابوں کے اس طرف بیٹھ کر پہلے کی طرح انہیں مشورے دوں ــــ نہیں بلکہ تھپک تھپک کر تسلی دوں۔ لیکن ایک ہی لمحے میں وہ بدل گئے۔

"واللہ میں سب بھول جاتا ہوں، نہ جانے کمبخت دماغ کو کیا ہوگیا ہے۔ کل ہی کسی سے ہاکس بے چلنے کا وعدہ تھا —— کاٹج بھی ریزرو کرالی تھی، مگر پھر میں بھول گیا۔"
گلو میاں نے بڑے سمارٹ طریقے پر مسکراتے ہوئے رک رک کر کہا —— کوئی اور وقت ہوتا تو میں یہ قصہ سن کر اسے مارنے دوڑتی مگر اس وقت مجھے یوں لگا جیسے وہ ایک دم پھیل رہا ہو۔ ونڈر لینڈ کی ایلس کی طرح جس نے شیشے کی میز پر رکھی ہوئی بوتل کا مشروب پی لیا ہو۔ میرے چھوٹے سے کمرے میں وہ ٹھنس کے رہ گیا جیسے —— میرا دم گھبرانے لگا تو میں الجھ کر دوسرے کمرے میں بھاگی اور اور جب میں اماں کے ساتھ پر تکلف چائے لیکر دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بڑے سٹائل سے میری ایک کتاب پکڑے میز سے لگے کھڑے تھے اور مجھے خیال آیا کہ ارے یہ تو گلو میاں ہیں۔

گلو میاں نے بڑی بے دلی سے چائے کے چند گھونٹ پئے اور بازار سے منگوائے ہوئے گرم گرم سموسوں اور مٹھائیوں کو چھوا تک نہیں۔ حالانکہ اماں چاہتی تھیں کہ ساری چیزیں گلو میاں کھا لیں —— جانے سے پہلے انھوں نے ہمیں دعوت دی کہ موٹر میں گھومنے چلیں —— اور ہم تیار ہوگئے۔

"کہاں چلیں؟" گلو میاں نے سٹیئرنگ وھیل پر جھک کر پوچھا۔

"ہاکس بے" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

راستے بھر موٹر کی نرم گدیوں پر اچھلتے ہوئے، مجھے یہ احساس ہوتا رہا کہ یہ گلو میاں مجھے بہت دلچسپ لگ رہے ہیں —— سڑک پر ٹھرا پی کر لڑکیوں پر آوازے کسنے والے کتنے برے معلوم ہوتے ہیں، لیکن موٹر میں بسی ہوئی الکحل کی ہلکی سی بو اور ہاکس بے کی کسی کاٹج میں بیٹھی ہوئی منتظر لڑکی، گلو میاں کے سر کے گرد ایک ہالے کی طرح چمک رہی تھی۔ خیال رہے کہ میں ایک پڑھی لکھی شریف لڑکی ہوں اس لئے بغیر جواز پیدا کئے میں کچھ تسلیم نہیں کرتی —— میں نے طے کرلیا تھا کہ شیریں بیحد ٹھنڈی مٹی

قسم کی عورت ہے ، شاید اس لئے گلو میاں میرے لئے اور بھی دلچسپ ہو گئے ۔

گزرتے ہوئے وقت کو اس لمحے ایک دھچکا سا لگا جب ایک رات گلو میاں کی اماں موٹر سائیکل رکشا میں بیٹھ کر ھانپتی کانپتی ھمارے ھاں پہنچیں ۔

" اے جلدی چلو فاطمہ بائی نگوڑ ماری پر نکاح کا بھوت سوار ہے ۔ " انھوں نے بے حد ہول کر بتایا ۔

" روتی ھوں " اماں تصویر حیرت بن گئیں ۔ اور مجھے ھنسی آنا شروع ھو گئی ۔ واہ گویا فاطمہ بائی کی لگام ھمارے ھاتھ میں تھی ۔ پھر مجھے ھمدردی ذرا کم ھی ھوئی ! پچھلے چند ماہ سے گلو کی اماں نے ھمیں پوچھا تک نہ تھا ۔

" تو کس کے نکاح کا بھوت سوار ہے ۔ " بھائی جان نے بے نیازی سے پوچھا ۔

" اے اپنے نکاح کا — " گلو کی اماں نے وضاحت کی ۔

" تو کرنے دیجئے " بھائی جان نے اسی بے نیازی سے جواب دیا اور گلو کی اماں رو پڑیں —

" نکاح کر لیں گی تو سب چرپٹ ھو جائے گا ، ھمارا کیا ھو گا ۔ " گلو کی اماں نے یہاں سے بات شروع کی تو سب کو قائل کر کے چھوڑا ۔ وہ مصر تھیں کہ ھم لوگ چل کر فاطمہ بائی کو سمجھائیں کہ وہ اپنے ارادے سے باز آجائیں ۔

ھم لوگ شاید اس قصے میں نہ پڑتے مگر یہ کھوج بھی بری بلا ہے اماں جھٹ تیار ھو گئیں ۔ ھم سب پہنچے ۔

فاطمہ بائی حسب معمول باوقار نظر آرھی تھیں ۔ وہ ھمیشہ کی طرح ھم سے بڑی مدارات سے پیش آئیں — گلو کی اماں نے بڑی چالاکی سے قصہ چھیڑا تو فاطمہ بائی ذرا چونکیں ۔

" اے سمدھن بی اللہ رکھے بیٹی داماد کے ھوتے نکاح کیسا ؟ میری اماں نے بے تکے پن سے فوراً کہہ دیا ۔ لیکن فاطمہ بائی ضبط کر گئیں — پھر انھوں نے اپنی مخصوص اردو میں ھمیں اپنا نقطۂ نظر سمجھایا — ساری گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ اگر نکاح نفس کے لئے کرنا ھوتا تو بیٹی کی شادی سے پہلے ھی کر چکی ھوتیں انھیں اب خود بھی نکاح کرتے شرم آتی ہے مگر

کیا کریں اتنا کاروبار ہے کیسے چلے ، کوئی تو دیکھ بھال کرنے والا ہو — بیٹی کی شادی شریف آدمی دیکھ کر اسی لئے کی تھی کہ کاروبار سنبھالے گا داماد ، مگر کاروبار سمجھنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں گلو میاں پر بھروسہ کر کے دیکھا۔ اُن کا دل اور ہے — اور کاروباری کا دل دوسرا ہوتا ہے — یہ سب بنا بنایا ڈوبا جا رہا ہے ، یہ تو نہیں دیکھا جا سکتا ۔ دولت رہے گی تو گلو میاں اور ان کی اولاد ھی کے کام آئے گی —— غیروں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے مجبوراً نکاح کئے لے رہی ہیں۔ تاکہ کاروبار کی صحیح دیکھ بھال ہو سکے — یہ توجیہہ جیسے سن کر گلو کی اماں تلملا گئیں اور چینخ کر بولیں ۔ دنیا کیا کہے گی ؟ "

" دنیا تو پہلے بھی بہت بولا جب ہم گل سیٹھ کو داماد بنایا ۔ ہم کو پروا نئیں ، دنیا کچھ بولے تو ہم اپنا کاروبار لٹا دے — "

فاطمہ بائی نے تڑسے جواب دیا ۔

میری اماں نے قائل ہو کر سر ہلا دیا اس کے بعد ہمارے سامنے ہمیشہ کی طرح پرتکلف چائے پیش کی گئی ، مگر چائے پیش کرنے والے ابراہیم بھائی نہیں تھے کیونکہ وہی تو اس کاروباری نکاح کے دولہا منتخب ہوئے تھے —

یہ بات تو صاف تھی کہ ابراہیم بھائی نے گلو میاں کی کاروباری نالائقی کو مکمل کرنے میں کتنا بڑا رول ادا کیا ہو گا — مگر ھمیں ایک اطمینان تھا کہ اس جھگڑے میں گلو میاں بالکل الگ ہوں گے ۔ بلکہ جب وہ دیکھیں گے کہ ان کی اماں اس کاروباری شادی کے خلاف مہم چلائے ہوئے ہیں تو یقیناً بہت ناراض ہوں گے — حالانکہ ان کی اماں بےچاری انہیں کے مستقبل کی فکروں کے مارے یہ بھاگ دوڑ کر رہی تھیں ۔ کیونکہ ان بےچاری کا خیال تھا کہ ممکن ہے ابراہیم بھائی بعد میں جائداد میں بھی حصہ دار بن بیٹھے ، اور ان کے بیٹے کا نقصان ہو ۔

میں نے سوچا اگر گلو میاں کو معلوم ہو کہ ان کی اماں کن فکروں اور چالوں میں مبتلا ہیں تو شاید گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں حضرت —— ، مگر وہ ھمیں ملے نہیں ۔ میں نے ایک دن انہیں

ایرانی ہوٹل سے ٹیلی فون بھی کرنے کی کوشش کی مگر وہ فون پر بھی نہ ملے۔

پھر خبر سنی کہ شیریں کو بخار رہنے لگا ہے۔ ایک دن میں اور اماں اس کی عیادت کو پہنچے۔ شیریں اپنی خوبصورت خوابگاہ میں تھی اور گلو کی بہن اور اماں اس کے سرھانے بیٹھی تھیں۔ فاطمہ بائی اوپر کچھ لیکر آئیں تو گلو میاں کی اماں نے موقع غنیمت جانا۔

"بہو کے دل کو صدمہ ہے، باپ کو یاد کرتی ہوگی جبھی تو بخار رہنے لگا ہے۔" انھوں نے میری اماں سے مخاطب ہو کر کہا۔ اور میری اماں ہر بات سن کر پہلے اتفاق کرنے کی عادی ہیں انھوں نے بھی ھاں میں ھاں ملا دی ــ اس پر فاطمہ بائی بالکل بکھر گئیں۔ اور گلو میاں کی اماں کو کئی سخت باتیں کہہ ڈالیں۔

گلو میاں کی اماں نے عورتوں والا حربہ استعمال کیا اور رو رو کر کہنے لگیں۔ "ھائے تم نے میرے ھیرے جیسے بچے کو پھانس لیا اب چلی ہو باتیں کرنے۔"

یہ سن کر فاطمہ بائی آگ بگولہ ھو گئیں، انھوں نے ھمارے سامنے ھی بخار میں تپتی ہوئی شیریں کو گھسیٹا کہ وہ نیچے چلے اور پھر کبھی گلو کی صورت نہ دیکھے۔ "تم لوگ ھیں کیا۔ ھم جانتا۔"

فاطمہ بائی شیریں کو لے جاتے ہوئے چیخیں اور گلو کی اماں دھاڑیں مارنے لگیں۔

اس ھنگامے میں کہیں سے گلو میاں آگئے ــ انھوں نے ایک لمحے کو یہ تماشہ دیکھا اور پھر تیزی سے دوسرے کمرے میں چلے گئے ــ مجھے گلو میاں کی صورت دیکھ کر ڈر لگا ــ بالکل مینڈک کے پیٹ جیسی رنگت اور ٹھیری ہوئی پتلیاں ــ شیریں سسکتی ہوئی فاطمہ بائی کے ساتھ نیچے جا چکی تھی اور اب گلو کی اماں بھی خاموش تھیں مگر گلو میاں دوسرے کمرے سے نہ نکلے۔

"اے توبہ، خدا نہ لے جائے ایسے بدتمیزوں کے گھر، ھمارے ھاں تو لکھ پتی بیٹی والے اپنے گھسیارے داماد کے

سامنے ہاتھ ہی جوڑتے ہیں۔ کہاں کے موئے جنگلی ہیں۔ اب کوئی یہاں تھوکنے بھی آیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا — '' اماں نے فاطمہ بائی سے سلام کا جواب نہ پا کر ان کی کوٹھی سے نکلتے ہوئے کہا۔ اور میں نے بھی سوچا واقعی ہمیں کیا، خوامخواہ اپنی سبکی ہوئی نا۔

لیکن دوسرے دن صبح صبح ہی گلو میاں کی اماں اور بہن روتی سسکتی ہمارے ہاں پھر آ پہنچیں۔

'' خدا کے لئے بہن جلدی چلو، بٹو کو بھی لے چلو، اے بٹو کہیں سے اپنے بھائی کو ٹیلی فون کر کے بلا لو۔ '' گلو کی اماں کرسی پر یوں بیٹھیں جیسے غش آگیا ہو۔

'' ہائے اللہ جلدی چل کے کوئی گلو میاں کو سمجھاؤ۔ ورنہ جانے کیا ہو جائے گا۔ '' گلو میاں کی زرد رو بہن کا چہرہ رو رو کر سرخ ہو رہا تھا۔

'' ارے ہوا کیا؟ '' اماں نے اطمینان سے پان کی گلوری موڑی اور منہ میں رکھ لی۔

'' اے بتاؤں کیا تم لوگ تو بس چل کے گلو میاں کو وہاں سے لے آؤ۔ وہ تمہاری بات مانے گا۔ '' گلو کی اماں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ '' آج تو اللہ نے بچا دیا ورنہ میرے منہ میں خاک انھوں نے تو اپنی طرف سے خاتمہ ہی کیا تھا۔ ''

'' خاتمہ، کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ '' میں ڈری۔

'' شیریں کے برادری والے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں، کل اس حرافہ بڈھی کا نکاح ہے۔ رات گل میاں غسلخانے میں تھے، کوئی دو بجے ہونگے تو کسی نے گولی چلائی تکئے میں لگی آ کر — اور نیچے شور مچا دیا، چور چور — اگر وہاں گلو میاں ہوتے تو ہائے اللہ کیا ہو جاتا؟ زہرہ نے خوف سے آنکھیں پھاڑے ہوئے بتایا۔

اور ہم سب ذرا دیر کو مارے خوف کے خاموش ہوگئے۔ میری کھلی آنکھوں کے سامنے گلو میاں کا کالا سا چہرہ آگیا، کھوپڑی اڑی ہوئی اور سفید بھیجے کے ذرے ہر طرف بکھرے ہوئے۔ خوف اور نفرت سے میں نے جھرجھری لی یا اللہ بے بسی کا یہ تصور کس قدر گھناؤنا تھا۔

"ہم تو جبھی کہتے تھے آپس میں کہ بھلا یہ بیل کیسے منڈھے چڑھے گی - اے چھوڑ چھاڑ کے آجائے نا وہاں سے گلو -" اماں نے گھبرا کر پاندان بند کیا -

"ہائے اللہ کوئی انہیں چل کر لے آؤ - وہ تو نہیں آتے — وہ تو کہتے ہیں، وہ گھر میرا ہے، میں نہیں چھوڑوں گا —" گلو کی بہن سسک سسک کر رونے لگی -

"ہم کیسے جائیں، ہم کیا کر سکتے ہیں -" اماں نے سوکھے منہہ سے کہا - وہ بہت زیادہ ڈری ہوئی تھیں -

گلو کی اماں اور بہن کی انتہائی خوشامد کے باوجود ہم ان کے ساتھ نہ گئے - ظاہر ہے کہ جہاں معاملہ اس حد تک پہنچ چکا ہو وہاں جاکر اپنی ٹانگ کیسے جان بوجھ کر پھنسائے کوئی — ؟

رات جب بھائی جان گھوم پھر کر آئے تو اماں نے کروٹ بدل کر بڑے دکھ سے کہا -

"بیچارہ گلو اس سوکھی مری شیریں کے لئے وہاں بیٹھا ہے جان کی بازی لگائے، دیکھ لینا وہ لونڈیا بھی ماں کی حمایتی رہے گی، اگر وہ چاہتی تو ماں نکاح کا نام لے سکتی تھی بھلا ؟"

"ہوں" بھائی جان نے کہا اور کروٹ بدل لی - شام کو تو وہ گھنٹوں اس موضوع پر باتیں کر چکے تھے نا - ان کا فیصلہ تھا کہ اس لغو قصے سے ہمیں کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہئے -

اور میں رات کو سوتے میں بھی کسی خوفناک خبر کی منتظر رہی —— صبح صبح اخبار میں نے ہی اٹھایا - مگر وہ خوفناک خبر نہ آئی — دوسرے دن بھی میں سب سے پہلے جاگی اور اخبار اٹھایا کیونکہ اس دن فاطمہ بائی کو ابراھیم بھائی کی بیوی بن چکنا تھا - تیسرے دن بھی میں اخبار گرنے کی آواز سے جاگ اٹھی —— اور اسی طرح کئی دن تک —

پھر ایک دن میں نے ایرانی کے ہوٹل سے فاطمہ بائی کے گھر فون کیا -

"ہلو ! گل بھائی ہیں -" میں نے بڑے اسٹائل سے پوچھا -

اور کسی نے زور سے ٹیلی فون بند کر دیا ۔ مگر جناب انسانی ذہن ٹیلی فون تو ہے نہیں کہ جب چاہا سنا جب چاہا نہیں ۔ میں بچوں کی طرح " پھر کیا ہوا " کا جواب سننا چاہتی تھی ۔ انہی دنوں میرا امتحان قریب آگیا ، جی چاہتا تھا کہ کراچی میں بکھرے ہوئے دور قریب کے رشتے داروں میں جاؤں کہ شاید کہیں سے کوئی سن گن ملے ، لیکن پڑھنے سے فرصت ہی نہ ملتی تھی ۔ مجھے رہ رہ کر افسوس ہوتا کہ اس دن ذرا گلو میاں کی اماں کے ساتھ چلے جاتے تو کیا ہرج تھا ۔ کوئی فاطمہ بائی ہمیں پھانسی تو نہ دلوا دیتیں ۔ کتابوں سے سر مارتے مارتے مجھے گلو میاں یاد آ جاتے وہ ایک زمانے میں کتنی کتنی عقیدت سے کبھی میری یہ کتابیں دیکھتے تھے اور کبھی مجھے ۔ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں نا کہ گھر میں میرا نوٹس بہت کم لیا جاتا تھا ۔

ایک دن میں نے ڈرتے ڈرتے بھائی جان سے کہا ۔

" ارے بھائی جان وہ گلو میاں نہیں ملتے کسی کو ۔ "

" ہاں ، سنا ہے طنطنے میں فاطمہ بائی کی شادی کے دن وہاں سے چل دئے تھے ۔ "

بھائی جان نے بیزاری سے جمائی لیکر بتایا ۔

" ارے سچ پہلے نہ بتایا تم نے ؟ " اماں نے پوچھا ۔

" بتاتا کیا ۔ نرا گدھا ہے ؟ " بھائی جان نے دوبارہ جمائی لیکر کہا ۔

" اب کہاں ہیں وہ لوگ ۔ " میں نے دبی آواز میں سوال کیا ۔

" مجھے کیا خبر ، خبر نہ ہو یہی بہتر ہے ، رہنے کا ٹھکانہ تو ہوگا نہیں ۔ ان لوگوں کے پاس ۔ اور ہمارا فلیٹ ہر ایک کو بڑا معلوم ہوتا ہے ۔ "

بھائی جان اتنا کہہ کر اخبار پڑھنے لگے ۔ اماں باورچی خانے میں چلی گئیں اور میں اپنی کتابوں پر جھک گئی ۔ میری آنکھوں کے سامنے گلو میاں کی پرانی سرج کی شیروانی کا گھسا ہوا دامن پھڑ پھڑایا تو میں نے کتاب کا ورق الٹ دیا ۔ میرا امتحان قریب تھا نا ۔

امتحان کے لئے لاهور جانے میں چند دن باقی تھے - آخری دن ''پنجاب سے امتحان پاس کرانے کی گارنٹی دینے والے کالج'' سے پڑھ کر نکلی تو بولٹن مارکیٹ کے ایک بس اسٹاپ پر رک کر میں نے سوچا که یہاں سے کلاتھ مارکیٹ جانا چاهئے شاید کوئی عمده لیکن سستا ڈوپٹه مل جائے - میرے رومال میں پانچ روپے کا نوٹ بندھا هوا تھا جو اماں نے بے حد حجت کے بعد مجھے دیا تھا - کیونکه اُن کا خیال تھا که میرے پاس چار ڈوپٹے هیں اور یه کافی هیں - اماں کی کنجوسیوں کے خیال سے میری آنکھوں میں نمی آ گئی - اب بھلا لاهور جانا هو اور کوئی شیفون تک کا ڈوپٹه پاس نه هو، حد هے؟ (میں نے سن رکھا تھا که لاهور کی لڑکیاں بڑی خوش لباس هوتی هیں) جی چاها پانچ روپلی کا نوٹ کھول کر هوا میں اڑا دوں اور وهیں بس اسٹاپ پر بیٹھ کر خوب روؤں -

میں نے خود کو بہلانے کے لئے سڑک پر آتی جاتی لمبی لمبی اور نئی نئی موٹروں کو گننا شروع کر دیا - جن کی تعداد میرے دیکھتے دیکھتے کراچی کی سڑکوں پر بڑھتی هی جا رهی تھی -

ایک — دو — هائے الله کیا رنگ هے ایسی ساری هو تو — ! تین — کیا خوبصورت عورت ناز سے منه اونچا کئے بیٹھی هے اور ساری کا رنگ هائے الله - ارے یه کون حرامزاده میرے کولہے پر دھپ جماتا گزر گیا پیچھے سے — ؟ سامنے سے آتے هوئے پہلوان سے اپنا کندھا بچاتے هوئے — میں پھر روهانس هو گئی — چار — پانچ کئی موٹریں گزر گئیں ان میں لڑکیاں تھیں، کتنی آزاد کتنی مطمعن - اور میں ابھی تک بس کے انتظار میں کھڑی تھی - بس جس میں گھستے هوئے بہت سے ٹھو کے کھانا تھے - چھ - سات - هائے کیا نفیس پیلا شیڈ هے - ایسا هی دوپٹه لوں تو — مگر یه تو گلو میاں تھے - میرا هاتھ بے ساخته اٹھ گیا هلکے پیلے رنگ کی لمبی سی نئی امریکی کار زور سے بریک لگا کر رک گئی -

''ارے گلو میاں تم؟'' میں نے هکلا کر کہا اور میرا هاتھ موٹر کی چکنی سطح سے پھسل گیا -

"کہاں جانا ہے چلئے میں پہنچا دوں" گلو میاں نے سیاہ چشمہ اتار کر صاف کیا اور اپنے پہلو کا دروازہ میرے لئے کھول دیا۔ موٹر چل پڑی مگر میں سناٹے میں تھی۔ گلو میاں اور اس نئی موٹر کا تعلق میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہیں ڈرائیوری تو نہیں کرنے لگے۔

"کیا کرتے ہو گل میاں آج کل؟" میں نے گلا صاف کر کے پوچھا۔

"کاروبار کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔" گلو میاں نے اونچی آواز میں جواب دیا۔ مجھے بھائی جان کی ناقص اطلاعات پر غصہ آ گیا۔

"شکر ہے، سب معاملہ ٹھیک ہو گیا ——— ، ایک بار میں نے فون کیا تھا جانے کس نے بند کر دیا تمہارا نام سن کر ــ شیریں کیسی ہیں؟" میں نے کہا۔

"اچھا تو آپ کو میری فکر تھی۔" گلو میاں نے بڑے اجنبی انداز سے میری طرف دیکھا۔ اور میں گڑبڑائی۔

"تم ہم سے ناراض ہو، دیکھونا اُس دن ممانی آئیں تو ——— بھائی جان ــ" ــ میں نے صفائی پیش کرنا چاہی ـــ ظاہر ہے کہ ان کی اماں بہن نے انہیں ہمارے خلاف خوب بھرا تھا۔

"واللہ جانے دیجئے ـــ بھلا میں کیوں ناراض ہونے لگا؟" گلو میاں نے سگریٹ جلائی۔

"ارے ہاں ایک خبر تو سنی نہ ہو گی آپ نے۔ زہرہ بجیا کی شادی ہو گئی۔" گلو میاں نے کہا۔

"اچ چھا۔" میرا گلا مارے رنج اور غصے کے بھر آیا یہ ترک تعلق نہیں تو اور کیا ہے کہ زہرہ کی شادی میں ہم لوگوں کو پوچھا تک نہیں۔

موٹر ایک دھچکے سے ایک شاندار دکان کے سامنے رک گئی

"معاف کیجئے میں ذرا دولھا بھائی کو لے لوں انہیں گھر چھوڑنا ہے۔" گلو میاں نے مجھ پر جھک کر کہا اور مجھے اسپرٹ جیسی چکرا دینے والی بو آئی ـــ اور پھر وہ اعتماد سے قدم اٹھاتے دکان کی شفاف سیڑھیوں پر جا کھڑے ہوئے ـــ چند لمحہ بعد ایک نہایت گدھ شکل بوڑھا گھٹنوں

پر ھاتھ رکھتا گلو میاں کے ساتھ دکان سے اترا اور گلو میاں نے موٹر کا پچھلا دروازہ کھول دیا —— کار دوبارہ فراٹے بھرنے لگی ۔ اور میں چکرا گئی ۔

’’ دولھا بھائی کو چھوڑ دوں ، پھر ھاکس بے کی سیر کراؤں گا آپ کو ، چلیں گی ۔ ‘‘ گلو میاں نے بے حد پر اسرار آواز میں مجھ سے سرگوشی کی ۔ اور میرے اندر ھتک کا احساس شعلے کی طرح بھڑک اٹھا —— تو میں —— میں ۔ منشی فاضل کی کتابیں میری گود سے لڑھک کر نیچے گر گئیں ۔

میں نے مڑ کر بوڑھے گدھ شکل زھرہ کے دولھا کو دیکھا اور پھر گلو کو ۔ ان دونوں سے مجھے ڈر لگا ۔ اور ایک نہ نکل سکنے والی چیخ میرے گلے میں ٹھنس کر رہ گئی ۔

میرے گھر کی گلی آئی اور گزر گئی ۔ در اصل یہ نئی موٹر بے حد تیز رفتار تھی ۔

خدیجہ مستور



کانٹا

جلال میاں آج خواہ مخواہ فکر کئے چلے جا رہے تھے تعلیم ختم کرنے کے بعد اس ٹھاٹ سے پرائی روٹیوں پر عیش کرنا کچھ زیادہ نہ بھا رہا تھا۔ اچھی سی ملازمت کی تلاش تھی۔ مگر خالو جان کو تو دنیا کا ہوش نہ تھا جب سے ان کے ابا کی حالت خراب ہوئی تھی، وہ کسی کام کے نہ رہ گئے تھے اور اچھی سی ملازمت ان کی مدد کے بغیر ملنا ناممکن تھی۔

"بھئی جانے کیا سوچے جا رہے ہیں پڑھائیے نا۔" ثریا اسے یوں چپ چاپ دیکھتے دیکھتے اکتا گئی تھی، کتنی دیر سے کتابیں لئے بیٹھی تھی مگر وہ حضرت تھے کہ سوچ میں غرق،

"میں سوچ رہا ہوں ثرو کہ کب ملازمت ملے گی اور کب تمہیں انگوٹھی پہناؤں گا!"

فکروں سے نجات دلانے کے لئے یہ عشق بھی امرت دھارے سے کچھ کم نہیں ہوتا، ثریا کی اکتاہٹ ختم ہو گئی اور وہ شرما کر کتاب کے ورق الٹنے لگی۔

"ملازمت تو اس وقت ملے گی جب دادا جان مریں گے" — اس نے ایک لمبی سانس لی — "اور اس کے لئے ایک عمر چاہئے جلال بھائی" وہ رنجیدہ ہو گئی۔

"اب تو ان کی حالت سخت ردی ہو رہی ہے"

" پر جلال بھائی یہ دادا جان تو کسی اچھے موقعہ سے مرینگے ، شاید اس وقت جب میرے ارمان مر چکے ہونگے یا پھر میں ہی " — اس کا گلا روندھنے لگا ۔

" ثرو تم پٹو گی میرے ہاتھ سے " جلال اسے بہلانا چاھتا تھا کہ خالہ بی دادا جان کے کمرے سے نکلیں ، تیز تیز قدم اٹھاتی صحن تک آئیں پھر دھڑام سے پلنگ پر گر کر الٹی سیدھی سانسیں لینے لگیں ، باورچی خانے سے بوا نصیبن بھاگیں ، جلال کی امی بھی کسی کمرے سے نکل کر دوڑیں ۔ ادھر سے جلال اور ثریا بے تحاشہ بھاگے ۔

بوا نصیبن ان کے تلوے سہلا رہی تھیں ، جلال کی امی بہن کا سر گود میں لئے سہلا رہی تھیں ۔

"اے باجی ، باجی ، ارے کیا ہو گیا —— اے جلال دوڑ کر کسی ڈاکٹر کو بلاؤ بیٹے ——" ثریا اپنی امی کی یہ حالت دیکھ کر بری طرح رو رہی تھی —— جلال ڈاکٹر کو بلانے مڑا ہی تھا کہ خالہ بی نے آنکھیں کھول دیں اور جلال کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا ۔

" میں — میں تو بالکل — اچھی ہوں " — وہ مسکرائیں — ان کی زبان بند ہو گئی ہے ۔" انہوں نے بڑی نقاہت سے کہا

" ایں کیا بڈھے کی زبان بند ہو گئی ؟" جلال کی امی مارے نفرت کے بہن کے خسر کو بڈھا کہا کرتی تھیں ۔

"کیا سچ دادا جان کی زبان بند ہو گئی " — ثریا جلال کی طرف بڑھی —— "ھائے جلال بھائی ذرا جا کر دیکھئے کہیں امی کو دھوکا تو نہیں ہوا " جلال چپ چاپ کھڑا تھا ۔

"میں کہتی ہوں بہو بیگم کو دھوکا ہی ہوا ہوگا " بوا نصیبن کو یقین نہ آ رہا تھا ۔

" جائیے نا جلال بھائی " ثریا نے جلال کا بازو کھینچا ۔ اس نے بڑی بے بسی سے ثریا کی طرف دیکھا ۔

" میں نہیں جا سکتا " — تین سال پہلے کی بات وہ بھولا نہیں تھا ۔ اس کے ابا ڈبل نمونیے میں مر گئے تھے ۔ وہ تعلیم چھوڑ کر کارکی کی تلاش میں تھا کہ خالہ بی کھڑی ڈولی آئیں اور بہن اور بھانجے کو کلیجے سے لگا کر اپنے گھر لے آئیں ۔

اس کی امی نے تو اتنی شاندار عمارت میں آکر فوراً آنسو پونچھ ڈالے تھے لیکن اس کا جی نہ لگ رہا تھا ۔ امی نے خالہ جی کے خسر کے لئے ہزاروں قصے سن رکھے تھے ۔ وہ جانتا تھا کہ خالہ بی کے عزیزوں کو ایک منٹ کے لئے بھی برداشت کرنا مشکل ہے ، اس سے پہلے اس گھر میں اس نے کبھی قدم نہیں رکھا تھا ۔ کبھی تیسرے چوتھے مہینے خالہ بی چند منٹ کے لئے آتیں رو رو کر اس کی امی سے باتیں کرتیں اور جلدی سے چلی جاتیں ـــ جس وقت سے وہ یہاں آیا تھا دل پر عجیب سا بوجھ محسوس کر رہا تھا ـــ شام کو جب خالو جان دفتر سے آئے تو وہ ان کے ساتھ دادا جان کی مزاج پرسی کو گیا ۔ امی بھی ساتھ تھیں ، دادا جان نے بڑی بے اعتنائی سے سب کو دیکھا ۔ خالو جان نے بے حد خوش ہوکر انہیں بتایا کہ وہ جلال کو اپنے گھر لے آئے ہیں ۔ وہ بس یہیں اپنی تعلیم پوری کرے گا ـ چار سال کی طویل بیماری نے انہیں کتنا کمزور کر دیا تھا ۔ پھر بھی غصے سے ان کا چہرا سرخ ہو گیا ۔

" ان سے کہو نصیر بلڈنگ یتیم خانہ نہیں ہے " وہ بری طرح کپکپا رہے تھے ۔ " ہم ان کی یتیمی کے ذمہ دار نہیں ہیں ۔ یتیم ہو گئے ہیں تو بھیک مانگ کر پیٹ بھریں ۔ مزدوری کر کے روٹی کمائیں ۔ نصیر بلڈنگ میں کسی کے لئے جگہ نہیں ہے ۔ ہم نے دولت ان کے لئے جمع نہیں کی " جلال کے خالو نے شرم سے سر جھکا لیا ۔ امی سسکیاں بھرتی ہوئی باھر بھاگیں ۔ اور وہ اپنے کمرے میں جاکر سامان باندھنے لگا ، خالہ بی نے سنا تو دوڑی آئیں اور بہن بھانجے سے لپٹ لپٹ کر رونے لگیں ـــ " میں نہیں جانے دونگی ، تم یہیں رہو گے تم لوگ چلے گئے تو میں دکھ سے مرجاؤنگی ، اب بڈھے کو معلوم ہی نہیں ہو گا کہ تم لوگ یہاں ہو ، اللہ نے اسے چلنے پھر نے سے معذور کر دیا تمہارے خالو بھی یہی کہتے ہیں کہ اب ابا جان کو کچھ نہیں معلوم ہو گا ـــ " جلال اپنی بات پر اڑا رہا ۔ وہ جائے گا اور ضرور جائے گا ، محنت کر کے روٹی بھی کمائے گا اور تعلیم بھی پوری کر لے گا ۔ مگر عین وقت پر ثریا آڑے آ گئی ، خالہ بی جلال کی ضد پر روتی روتی کمرے سے نکل

گئیں تو ثریا سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''جلال بھائی کیا آپ سچ مچ چلے جائیں گے۔ آپ تو ایک دن بھی ہمارے پاس نہیں رہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلئے''۔۔۔وہ منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

''ارے تو یہ بات ہے''۔ اس نے ثریا کا منہ اپنی طرف پھیرا تو وہ جانے کیسی الٹی پلٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جلال نے چپکے سے سامان کھول دیا۔ ثریا کمرے سے بھاگ گئی، تھوڑی دیر تک اس کا دل اتنی زور سے پھڑکتا رہا کہ پسینے آ گئے۔

خالہ بی ابھی تک آنکھیں بند کئے پڑی تھیں۔ ان کے چہرے پر ایسا سکون، مسرت اور تھکن تھی جیسے ابھی پلوٹھی کا بیٹا پیدا ہوا ہے۔

''ذرا دیر تک تو مجھ کم بخت کو یقین ہی نہ آیا کہ ان کی زبان بند ہو گئی ہے، جی مانتا ہی نہ تھا کہ میں بدبخت بھی یہ دن دیکھوں گی، اپنے نصیب میں بھلا کوئی خوشی کاہے کو آئی تھی۔ یہ حالت ہو گئی کہ پاؤں اب تک کانپ رہے ہیں''۔۔۔ مارے خوشی کے خالہ بی کا چہرہ چمک رہا تھا۔ ''اے بوا نصیبن ذرا سا انار کا شربت تو بنا لاؤ، اختلاج کے مارے برا حال ہے'' وہ کراہتے ہوئے اٹھ بیٹھیں، جلال بڑی سعادت مندی سے ان کے ہاتھ سہلا رہا تھا۔ بوا نصیبن شربت بنانے گئیں تو ثریا اپنی امی کے پاؤں سہلانے بیٹھ گئی، وہ بار بار جلال کی طرف دیکھ رہی تھی اور جلال نظریں چرا رہا تھا کہ کہیں خالہ بی کو کچھ شبہ نہ ہو جائے، بھلا وہ کیا کہیں گی کہ ان کے احسانوں کا یہی بدلہ ہے۔ ادھر خالہ بی جلال کو ہاتھ سہلاتے دیکھ کر مارے شفقت کے چہرے سے نظریں نہ ہٹا رہی تھیں۔

''باجی اب تو جی چاہتا ہے کہ آپ کے خسر کی زیارت کر آؤں، کان تو بند نہیں ہوئے ان کے۔ ذرا یہ تو بتا آؤں کہ ہم تو ٹھاٹ سے نصیر بلڈنگ میں رہ رہے ہیں اب کر لو جو کچھ کرنا ہے۔۔۔ اللہ توبہ، اتنے کالے دل کا آدمی زمانے میں نہ ہوگا، کیا کچھ نہ کہا تھا اس دن،، جلال کی امی رنجیدہ ہو گئیں۔

''اب جو تمہارے جی میں آئے کہہ لو''۔۔ وہ نصیبن کے ہاتھ سے شربت کا گلاس لے کر ایک ہی سانس میں پی گئیں ۔۔۔ ''اپنی بوا نصیبن کا جوڑا پکا رہا ۔ دل کی پیاس کا پہناؤں گی''۔

''لیجئے بہو بیگم اس سفید چونڈے پر''۔۔۔ بوا نصیبن سر کھول کر زور سے ہنسیں۔ جنم بھر اچھا کپڑا نہ پہنا تھا، بس حسرت ہی رہی کہ کبھی تو پھٹا پرانا ریشمی کپڑا جسم کو چھو جائے، وہی جنم بھر کی حسرت اس وقت آنکھوں میں ٹوٹ پڑی تھی۔ ثریا کی پیدائش کے وقت سے اس گھر کی خدمت کر رہی تھی۔ صرف روٹی اور پھٹے پرانے کپڑے پر۔ اس پر بھی ثریا کے دادا جان پیچھے پڑے رہتے کہ نکال باہر کرو سسری کو۔ یہ ادھر ادھر پھرنے والی عورتیں بہت خطرناک ہوتی ہیں ۔۔ وہ تو بہو بیگم اور ثریا کا سلوک تھا جو اس گھر میں بال پک گئے اور کبھی جانے کا نام نہ لیا ورنہ اس طرح تو روٹی کپڑا ہر گھر میں مل جاتا ہے، شوہر کے مرنے کے بعد یہ دوسرا گھر تھا جہاں اس نے نوکری کی اور یہیں کی ہو رہی۔ نہ کوئی عزیز نہ رشتے دار۔ جس دن سے اس گھر میں قدم رکھا پھر باہر کی صورت نہ دیکھی۔ ڈر کے مارے کبھی صاف کپڑا بھی نہ پہنا کہ بڑے میاں آوارہ کہہ کر کھال نہ ادھیڑ ڈالیں۔ ثریا کے پھٹے ہوئے ریشمی کپڑوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر رہ جاتی۔

''بس اس کے بعد تو ہماری ثریا بی بی کے ہاتھ پیلے کیجئے دھوم دھام سے'' بوا نصیبن ترنگ میں آچکی تھیں۔ جلال نے کنکھیوں سے ثریا کی طرف دیکھا وہ بھی چپکے چپکے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ارے کوئی دولھا ڈھونڈھنے جانا ہے جو دیر لگے گی، بس چالیسویں کی دیر ہے پھر دیکھنا خیر سے کیا دھوم مچتی ہے''۔ خالہ بی نے بڑی محبت سے جلال کو دیکھا تو اس نے بوکھلا کر نظریں جھکالیں۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خالہ بی سے لپٹ جائے۔ اسے کیا خبر تھی کہ انھوں نے اپنی بہن اور بھانجے کو اسی دن کے لئے تو کلیجے سے لگایا تھا۔ ورنہ ثریا میں تو وہ عیب تھا جو کسی گھر میں چین سے سانس نہ لینے دیتا۔

اس کی پیدائش کے وقت دادا جان کی بھیجی ہوئی جاہل دایہ نے جانے کیا ہیر پھیر کی کہ بچی کا ہاتھ شانے سے اتر گیا - ثریا کے ابا نے گھبرا کر کئی مرتبہ کہا کہ اسپتال سے ڈاکٹرنی بلالیں مگر دادا جان نے ڈپٹ دیا - یہ اسی کا انجام تھا کہ ثریا الٹے ہاتھ سے پاؤ بھر وزن بھی نہ اٹھا پاتی ، اس پر سے بدنامیاں ـــ دادا جان نے کہیں کا نہ چھوڑا تھا ـــ ”ثریا اسکول میں پڑھ کر آوارہ ہوچکی ہے“ ـــ اپنا دادا کیسا بھی ہو، لوگ خوب جانتے بھی ہوں ، پھر بھی کنواری لڑکی کے لئے تو ہر بات کا یقین کرلینے کو جی چاہتا ہے - اس گھر میں ثریا کے لئے کبھی بھولے سے بھی کوئی پیغام نہ آیا -



”چلو ثرو ، تھوڑا سا پڑھ لو“ - جلال جیسے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا - اس وقت ثریا اسے کیسی پیاری لگ رہی تھی -

”نہیں اب مت پڑھنا ، میں نے کلوا کو دفتر بھیجا ہے تمہارے خالو آتے ہی ہونگے ، وہ کہیں گے کہ ہمارے ابا کا تو آخری وقت ہے اور یہاں پڑھائیاں ہو رہی ہیں“ - جلال شرمندہ ہوگیا - اب بھلا کوئی کیسے ان کے آخری وقت پر منہ بنا کر بیٹھے ، وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگا تو ثریا بھی ساتھ ہو لی -

”جلال میرے ہاتھ کا عیب تمہیں تکلیف تو نہ دے گا؟“ وہ رنجیدہ ہو رہی تھی -

”ثرو - میں تمہارے وہ سب کام کردیا کروں گا جو تم سے نہ ہوسکیں گے - میں تمہارے بچے بھی کھلایا کرونگا اور“ ـــ

”ہائے چپ بھی رہئے“ - ثریا گھبرا کر دوسری طرف مڑ گئی ذرا دیر بعد خالو جان آگئے ، جلال ان کے پاس گیا مگر وہ کچھ

بھی نہ بول سکے ۔ چہرہ فق ہو رہا تھا ، وہ دو منٹ کے لئے اپنے باپ کے پاس گئے اور باہر آکر کلوا کو بلایا کہ جا کر خاندان کے سب گھروں میں اطلاع کردے کہ بڑے میاں کا آخری وقت ہے ۔ آکر منہ دیکھ لیں ۔ بعد میں کوئی گلہ نہ کرے۔

''جلال میاں تم ذرا ابا جان کے پاس بیٹھو ، مجھ میں تو اتنی طاقت نہیں کہ انہیں اس حال میں دیکھوں'' کلوا کے جانے کے بعد انہوں نے جلال سے کہا اور وہ بڑی سعادتمندی سے اٹھ کھڑا ہوا ۔

دادا جان کے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے وہ جھجک رہا تھا ۔ اس وقت بھی اسے وہی پرانی بات یاد آرہی تھی مگر وہ ہمت کر کے کمرے میں داخل ہوگیا ۔ کیا دل ہلا دینے والا منظر تھا ۔ اسی سال کی خشک ہڈیاں بستر پر ڈھیر تھیں ۔ سر کے بال اڑ گئے تھے ۔ ایک ذرا سے دانے نے پھیل کر پورے ہاتھ کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ روز کی مرہم پٹی کے باوجود سارے کمرے میں پیپ کی بو بسی ہوئی تھی ۔ بس ایک آنکھیں تھیں کہ گہرے گڑھوں میں پڑی ہر طرف دیکھ رہی تھیں ۔ سفید چمکتی ہوئی آنکھوں میں جانے کیا بات تھی کہ دیکھ کر جی ڈر جائے ، جلال ان کے سرہانے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تاکہ آنکھوں کا سامنا نہ ہو ۔ وہ ذرا ذرا دیر بعد انہیں پانی کی دو چمچیاں پلا دیتا ۔ اور وہ چڑیا کے بچے کی طرح اس کے سامنے منہ کھول دیتے ۔ تین چار بجے کے قریب خاندان کی پانچ چھ بوڑھی عورتیں دادا جان کو دیکھنے آئیں ۔ خالہ بی اور جلال کی امی ان کے ساتھ تھیں ۔ وہ سب آتے ہی جلال کو دیکھ کر جھجکیں ۔

''میرا بھانجہ ہے'' خالہ بی نے بتایا تو وہ سب کرسیوں پر بیٹھ گئیں ۔

ذرا دیر کے لئے بالکل خاموشی چھائی رہی ۔

''آپ لوگوں نے تو مجھے کبھی پوچھا ہی نہیں ۔ ایسا دل چاہتا تھا سب سے ملنے کو کہ کیا بتاؤں'' خالہ بی نے باتیں شروع کردیں۔۔'' مگر یہ ابا جان چھ برس سے بیمار ہیں ایک منٹ کی بھی فرصت نہ ملی کہ کہیں ادھر ادھر آجا سکوں ۔ کون سی بیماری تھی جس نے حملہ نہ کیا ہو'' ۔

''اللہ توبہ ہے گناہوں سے''— باتوں کا جیسے طوفان آگیا —
''ہمارا خود جی چاہتا تھا کہ تم سے ملیں پر نصیر بھائی کی وجہ سے گھر میں کبھی قدم نہ رکھا۔ آج جب کبیر میاں نے آخری وقت کی اطلاع دی تو دل نہ مانا۔ سوچا اسی بہانے تم کو اور کبیر میاں کو بھی دیکھ لیں گے، ورنہ سچ پوچھو تو دل میں گنجائش نہیں— وہ کون سی برائی تھی جو انہوں نے اپنوں کے ساتھ نہ کی ہو۔ اے تم سے تو کچھ چھپا نہیں۔ انہوں نے پولیس کی نوکری کرکے کونسا اودھم تھا جو نہیں ڈھایا۔ جس کے گھر چاہا چوری کا مال رکھا کر چھاپا ڈلوادیا۔ سال چھ مہینے کی قید ہوئی اور کلنک کا ٹیکہ لگ گیا۔ سگے چچا کی اتنی بڑی سفید داڑھی پر بھی رحم نہ آیا۔ دنیا اب تک انہیں چور کہتی۔ مرنے کے بعد بھی ٹیکہ نہ چھوٹا۔ اللہ انہیں اب معافی دے۔ ایسی جلاد طبیعت کس کی ہوگی، یاد نہیں پڑتا کہ کبھی زندگی میں کوئی نیکی کی ہو''۔

''اور یہ سگے چچا وہی تھے جنہوں نے بھائی کے مرنے کے بعد ان کو اور ان کی ماں کو پناہ دی۔ ان کے باپ تو اپنے پیچھے دھیلا چھوڑ کر نہ گئے۔ یہ پانچویں درجے میں پڑھتے تھے۔ چچا نے لاکھ پڑھانے کی کوشش کی پر جی لگے تب نا! طبیعت ایسی ادھمی کہ اپنے ذرا ذرا سے چچا زاد بھائی بہنوں کی ہر دم ٹھکائی کرتے رہتے۔ چچا نصیحت کرتے تو ان کی ماں کا منہ بن جاتا۔ وہ بھی بس ایسی ہی طبیعت کی تھیں۔ چھٹے درجے میں تین بار فیل ہوئے۔ اس پہ ہر دم کی لڑائی، بھئی ان کی بھی محنت کی کمائی تھی۔ اپنے بھی چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ تنگ آکر اماں بیٹے کو نکال باہر کیا۔ خیال تھا کہ دس پندرہ فاقے پڑینگے تو حواس درست ہوجائینگے۔ اور چچا سے معافی معانگ کر شریفوں کی طرح رہینگے، مگر انہوں نے تو کوئی ایسا کام نہ چھوڑا جس سے خاندان کی عزت تباہ ہو۔ بوٹ پالش کی، تیرے میرے گھر سودا سلف لانے کی نوکری اور اماں گھر گھر برتن مانجھتی پھریں، مگر ایسے نیک چچا کو پلٹ کر سلام تک نہ کیا۔ آخر میں انہوں نے انگریز کے گھر بیرے کی نوکری کی۔ جانے اس انگریز کے کس طرح جوتے سیدھے

کئے کہ اس نے انہیں ہیڈ کانسٹیبل بنوا دیا - پھر ترقی کر کے تھانیدار بنے اور انسپکٹر بن کر پنشن پائی - اس زمانے میں جو کچھ کیا وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ خاندان نے کئی بار چاہا کہ چلو گلے مل جائیں مگر ان کا سر تو آسمان سے لگا ہوا تھا غرور کے مارے'' --

'' اور جیسے سب کو جلانے کے لئے اپنی اور بیٹے کی شادی غیر خاندان میں کی - اب تم ہی بتاؤ دلہن ! اس گھر میں آ کر تم نے کونسا سکھ پایا جو ہم لوگ جلتے'' -

'' بس خدا ہی جانتا ہے جو گزری ہے'' خالہ بی منہ پر پلو رکھ کر زار و قطار رونے لگیں -- دادا جان کے ایک ھاتھ میں جانے کہاں سے زندگی امڈ آئی تھی کہ بار بار اٹھ رہا تھا - جلال نے جھک کر انہیں غور سے دیکھا اور کھلے ہوئے منہ میں ایک گھونٹ پانی ڈال دیا - آنکھوں میں عجیب بھیانک پن آرہا تھا -

'' جان نکلنے لگے تو سارا جسم کھنچتا ہے۔ کب سے ہے یہ حالت'' - ایک عورت نے جلال سے پوچھا -

'' جی کل رات سے'' -

'' اے خدا توبہ ہے گناھوں سے'' - زندگی میں کوئی نیکی نہیں کی - آسانی سے دم کیسے نکلے'' -

'' اب بھلا رونے سے کیا ہوگا - ارے دلہن تم تو بہو تھیں- انہوں نے اپنی سگی خالہ زاد بہن کو زہر دلوا دیا تھا - بے ماں باپ کی بچی تھی - سب کچھ ان ہی کو سمجھتی - شادی کے بعد اس کے سر پھرے میاں کو کچھ شک ہوگیا - آکر ان سے شکایت کی- کہنے لگے بس زہر دے دو، پولیس کا معاملہ میں ٹھیک کرلونگا- اور وہ بےچاری اٹھارہ سال کی عمر میں زمین کا پیوند ہوگئی ، ایسی خوبصورت تھی کہ دیکھے سے بھوک پیاس اڑے'' -

خیر -- دادا جان کے گلے سے کچھ ایسی آواز نکلی کہ سب ادھر متوجہ ہوگئے ، ان کا ھاتھ زور زور سے ھلنے لگا تھا -

'' بھئی کسی مولوی کو بلا کر سورہ یسین پڑھواؤ ، اللہ اب تو مشکل آسان کرے۔ نیک بندوں کا دم تو دیکھتے دیکھتے نکل جاتا ہے۔ ھائے ، اللہ سب کو نیکی کی توفیق دے''

'' خالو ابا کہتے تھے کہ ان کا ایک دوست بھی تھا ۔ ایک بار بیچارہ کسی الزام میں دھر لیا گیا ۔ بھاگا بھاگا ان کے پاس پہنچا کہ پولیس سے پیچھا چھڑا دو ۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ دوسو روپے دو تو ابھی بچائے لیتا ہوں ۔ یہ حال تھا پیسے کی ہوس کا ۔ یہ نصیر بلڈنگ ویسے ہی تو نہیں بن گئی ۔ جانے کتنے بے گناہوں کو پھانسا ، تب یہ سب کچھ بنایا '' ـــــ دادا جان کے گلے سے اچانک خر خر کی تیز آواز آنے لگی ۔

'' ارے کہیں گھرا تو نہیں لگ رہا ۔ توبہ میرے مولا گناہوں سے '' ۔ سب تھوڑی دیر کے لئے چپ ہوگئے ۔ پھر سب اپنے برقعے سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئیں ۔

'' اب تو اجازت دو دلہن ۔ اپنے تو ایسے دل ہیں کہ ان کا بھی یہ وقت دیکھا نہیں جاتا '' ۔

جلال کی امی اور خالہ بی سب کو چھوڑنے باہر تک گئیں ۔ شام کے پانچ بج رہے تھے ۔ کمرے میں بد بو اور باتوں کی رفتار سے جلال کے سر میں دھمک ہو رہی تھی ۔ مہمانوں کے جاتے ہی دادا جان کا گھرا ٹھیک ہوگیا ۔ بس آنکھیں ڈراؤنے حلقوں میں تیزی سے گردش کر رہی تھیں ۔ وہ انہیں پانی پلا کر کمرے سے باہر آگیا صحن میں بوانصیبن جیسے اس کے انتظار میں کھڑی تھیں ۔

'' جلال میاں ۔ میں نے یہ کھیر پکالی ہے ۔ اک ذرا بڑے پیر کی نیاز تو دے دیجئے ، بڑی مدت کے بعد خدا نے یہ دن دیکھایا ہے ۔ اب تو آپ کے دادا جان سے پیچھا چھٹے گا ۔ '' بوا نصیبن کھلی جارہی تھیں ۔ جلال جواب دیئے بغیر کمرے میں چلا گیا ۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ذرا دیر آنکھیں بند کر کے چپ چاپ پڑا رہے ۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دادا جان کا بے چینی سے ہلتا ہوا ہاتھ اس کے دل کی طرف بڑھ رہا ہے ۔ ابھی وہ اپنے بستر پر لیٹ بھی نہ پایا تھا کہ خالہ بی آ گئیں ۔

'' اے بیٹے وہ تمہارے خالو کے عزیز دار آگئے ہیں ۔ انہیں ذرا بڈھے کے کمرے میں لے جاؤ مجھے تو شرم آتی ہے سب کے سامنے جاتے ہوئے ، تمہارے خالو تو اپنے ابا کے غم میں سرنیوڑھائے بیٹھے ہیں جیسے بڑی دولت لٹی جارہی ہے اور دیکھو وہ ذرا چپکے سے کھیر پر

نیاز تو دے دینا، میں نے منت مانی تھی'' جلال نے نظریں جھکالیں۔ خالہ بی کے چہرے پر کتنی رونق تھی۔

جلال کمرے سے نکلا تو ثریا دروازے کے پاس سے لوٹ رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اس وقت ثریا سے تھوڑی دیر باتیں کرلے، شاید ذرا سی طبیعت ہلکی ہوجائے، اس نے آہستہ آواز دی مگر سامنے سے اس کی امی آرہی تھیں۔ وہ جلدی سے مہمانوں کے پاس چلا گیا۔

جب وہ سب کو لے کر دادا جان کے کمرے میں پہنچا تو وہ آنکھیں بند کئے بے حس و حرکت پڑے تھے۔ سب کے جاتے ہی انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ مہمان ایک لمحے کے لئے بے حس و حرکت کھڑے رہے۔

''خدا ان کے گناہ معاف کرے۔ ہم نے بھی معاف کیا''۔

''ہم نے بھی معاف کیا۔ انہوں نے کسر تو کوئی نہیں چھوڑی پھر بھی خدا مشکل آسان کرے''۔

دادا جان کا ہاتھ پھر ہلنے لگا اور گلے میں خرخر شروع ہوگئی۔

''کاش نصیر بھائی ایک بار بول سکتے تو میں ان سے پوچھتا کہ میرے باپ نے انہیں پناہ دے کر کون سا گناہ کیا تھا اور انہوں نے کس کی چوری کی تھی جو میں آج تک چور کا بیٹا کہلاتا ہوں'' چچا زاد بھائی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''معاف کردو بھائی، معاف کردو۔ ہم نے بھی معاف کیا۔ خدا ہمیں اس نیکی کا بدلہ دے گا''۔۔۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ سب کمرے سے باہر چلے گئے، جلال نے شربت انار کا ایک چمچا ان کے حلق میں انڈیل دیا۔ خرخر بند ہوگئی۔ وہ ٹکر ٹکر چھت تک رہے تھے۔ کاوا کو اندر بٹھا کر جلال باہر آگیا۔ خالہ بی کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

''باورچی خانے میں جا کر نیاز دے دو'' انہوں نے سرگوشی کی

''میں۔۔۔ میں''

''ارے ذرا وضو کر لے نا۔ توبہ ہے میری۔ آجکل کے لونڈے تونذر و نیاز سے کوسوں دور بھاگتے ہیں''۔ وہ چپکے سے باورچیخانے میں چلا گیا۔ بوا نصیبن ٹھمک ٹھمک کر نعمت خانے سے کھیر کے پیالے

نکالنے لگیں ۔

"رات کھانے پر اچھی طرح پیٹ بھر لینا جلال میاں گھر میں موت ہوجائے ۔ تو تین دن چولھا ٹھنڈا رہتا ھے"

"ھوں"! جلال جانے کیا سوچے جا رہا تھا ۔ وضو کر کے اس نے نیاز دی اور جلدی سے اپنے کمرے میں چلا گیا ۔

رات کھانے پر خالہ بی اور اماں اور ثریا کی ضد کے باوجود جلال نے کھیر نہ کھائی ۔ "مجھے میٹھی چیز اچھی نہیں لگتی خالہ بی، میرے حصے کی کھیر ثرو کو دے دیجئے"

"جلال بھائی ھماری خوشی میں شریک نہیں ھونا چاھتے" ثریا نے بڑی سنجیدگی سے کہا ۔

"یہ کس نے اطلاع دی ھے تمہیں"

"آپ ھی تو ھر دم دادا جان کے کمرے میں گھسے رھتے ھیں۔ صبح سے کسی نے ان کی صورت دیکھی ھے" ۔

"بھئی میں تو خالو جان کا خیال کر رھا ھوں اور اس لئے بھی کہ خالہ بی کا کچھ ھاتھ بٹا سکوں ورنہ مجھ سے کہو تو ادھر کا رخ نہ کروں" ۔

"لڑکی تو ھر دم نہ ستایا کر ۔ جب دیکھو شرارت، جب دیکھو طعنے، بھلا یہ بھی کوئی بات ھوئی" ۔

"اچھا تو لائیے جلال بھائی کے حصہ کی کیھر" ثریا نے منہ بنا کے کہا اور جلال کی امی نے بڑی شفقت سے کھیر کے دو پیالے اسے دے دیئے ۔

رات کوئی بھی نہ سویا ۔ خالو جان اپنے کمرے میں بیٹھے حقہ گڑ گڑاتے رھے ۔ دوسرے لوگ بڑے کمرے میں پڑے ھوئے پلنگوں پر بیٹھے چپکے چپکے باتیں کرتے رھے ۔ دادا جان کے کمرے میں کلوا کی ڈیوٹی لگی ھوئی تھی ۔ بوا نصیبن ضرور اپنی کھاٹ پر لیٹی کروٹیں بدل رھی تھی ۔ "دل کی پیاس" نے تمناؤں کی زبان پر کانٹے ڈال رکھے تھے ۔ خالہ بی اپنی بہن سے کھسر پھسر کئے جا رھی تھیں —— "وہ یاد ھے نا تم کو ۔ جب ثریا پیدا ھوئی تھی تو مئی کی گرمی پڑ رھی تھی ۔ جلال کے مرحوم ابا نے ایک خوبصورت سی صراحی بھیجی تھی ۔ میں نے وہ اپنے

سرہانے رکھ لی ۔ ایک گھنٹے میں پانی ٹھنڈا برف ہو گیا ۔ اس پہ کہیں بڈھے کی نظر پڑ گئی ۔ بس جل کے خاک ہی تو ہو گیا ۔ پردے کی اوٹ سے کنکری ماری اور صراحی میں اتنا بڑا سوراخ ہو گیا ۔ ہائے یہ آدمی تو مجھے ٹھنڈا پانی پیتے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا ۔ اس پر تمہارے بہنوئی کی بے زبانی ۔ باپ کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے ۔ اور وہ بھی یاد ہو گا ——"

ہزاروں بار کے دہرائے ہوئے قصے ختم ہونے ہی میں نہ آتے ۔ خالہ بی باتیں کرتے کرتے دادا جان کے کمرے کا پھیرا بھی لگا آتیں ۔ آدھی رات گزر چکی تھی ۔ ہلکی سی خنکی ہونے لگی ۔

"بوا نصیبن" کلوا نے کمرے کے پاس آ کر آواز دی ۔

"کیا ہوا" خالہ بی اور جلال کی امی ایک ساتھ کھڑی ہو گئیں ۔ بوا نصیبن بھی ہڑ بڑا کر اپنے پلنگ پر بیٹھ گئیں ۔

"کچھ نہیں جی ! بیڑی جلانے کو ماچس چاہئے" ۔

"باورچی خانے میں طاق پر رکھی ہے جا کر لے لے" ——

بوا نصیبن لیٹ گئیں —— "بس بیڑیاں پیتا رہتا ہے حرام زادہ" وہ بڑ بڑائیں ۔ ایک منٹ کے لئے سناٹا چھا گیا ۔

"پتہ نہیں جان کہاں اٹک گئی ہے" ۔ جلال کی امی نے لمبی سانس بھری "میں ذرا دیر پہلے دیکھ آئی ہوں ۔ چہرہ بالکل مٹی ہو رہا ہے ۔ مشکل سے صبح ہو گی" خالہ بی نے تسلی دی ۔

"صبح ہو گئی ۔ مٹی جیسے چہرے پر ابھی تو زندگی کے دانے پھوٹ رہے تھے ۔ وہ اب تک پٹر پٹر سب کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ آنکھوں میں عجیب سی بے بسی لرز رہی تھی ۔ اور ایک ہاتھ مسلسل ہلے جا رہا تھا ۔ جلال سرہانے بیٹھ کر یخنی پلانے لگا ۔ خالو جان ڈاکٹر کے ساتھ کمرے میں آئے ، اور فوراً چلے گئے ۔ تھوڑی دیر بعد ثریا آ گئی ، اس نے آج بڑی مدت کے بعد اس کمرے میں قدم رکھا تھا ۔ جلال نے اشارے سے بیٹھنے کو کہا ۔ اگر ثریا ساتھ دے تو تیمارداری کا وقت بڑے مزے سے کٹ جائے ، مگر ثریا تو پلک جھپکتے ہی جانے کو مڑی ۔

"بیٹھ جاؤ نا ثریا"

میں تو صرف تم کو دیکھنے آئی تھی - میں تو بہت خراب لڑکی ہوں جلال بھائی دادا جان کو میری موجودگی سے تکلیف ہو گی" - وہ جلدی سے باہر چلی گئی ، دادا میاں کے گلے سے دیر تک خر خر کی آواز آتی رہی - انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں -

یا تو صبح شام کا انتظار تھا یا سب پر ایک دم مایوسی طاری ہو گئی چھ دن تو اسی حالت میں گذر گئے -

"اے بہو بیگم ایسا حال تو ہم نے کبھی کسی کا نہ دیکھا - اللہ سے توبہ ہے - بے چارے جلال میاں کا تو اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے برا حال ہو گیا ہے - اتنا سا منہ نکل آیا ہے ، اب تو خدا معافی دے دے بڑے میاں کو" - بوا نصیبن کانوں کی لویں چھو کر گال پیٹنے لگیں -

" یہ آسانی سے نہیں مرینگے" — جلال کی امی سر ہلا کر کہتیں " ظالم کی رسی دراز ہوتی ہے - کہنا تو نہیں چاہئے مگر باجی سچی بات یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی یہ اس گھر سے نہیں جانے کے - یہ اپنی دولت پر سانپ بن کے بیٹھیں گے - ان کی جان تو صرف پیسے میں اٹکی ہوئی ہے" -

" ایسی باتیں تو نہ کیجئے امی " - جلال نے ٹوکا -

"ہاں بھئی ایسے وقت سے توبہ ہی کرو - ساری زندگی ترس ترس کے گذاری ہے - جانے کتنے بہت سے ارمان ہیں - روز سنتے ہیں کہ قائد اعظم پاکستان بنائینگے - اس مقدس زمین پر ابھی سے ایک مکان نہ بنا لیا تو پھر وہاں آنکھوں میں لگانے کو دھول بھی نہ ہو گی - میرا جی چاہتا ہے وہاں ایک مکان بنا کر اسے اپنے جلال کے نام کردوں - میرا کیا ہے کبھی یہاں رہے کبھی وہاں" - ان کے چہرے پر حسرت برس رہی تھی -

"ضرور بنائینگے مکان امی" - جلال نے تسلی دی -

علی گڑھ کالج سے ثریا کے دونوں بھائی بھی آ گئے تھے - اور چار دن کی چھٹی ختم ہونے والی تھی -

"خواہ مخواہ پریشان کیا ابا میاں نے تار بھیج کر ، پڑھائی

میں ہرج ہو رہا ہے'' انہوں نے کئی دفعہ جھلا کر کہا ۔ زبان بند ہوئے دس بارہ دن گزر گئے تھے ۔ ڈاکٹر روز آتا اور چلا جاتا ثریا کے ابا دفتر جاتے تو وقت سے پہلے ہی بھاگ آتے ۔ بوا نصیبن ان دنوں سخت جھلائی جھلائی پھرتیں ۔ جلال سارا دن دادا میاں کے کمرے میں بیٹھا انہیں دوا ، یخنی اور پانی پلاتا رہتا ۔ ثریا اداس پھرتی رہتی ۔ گھر میں عجیب انتظار اور مایوسی کی فضا تھی ۔ ثریا کے بھائی چار دن گزار کر چلے گئے ۔

'' ہے ، اپنے معصوم پوتوں کے ہاتھ سے اٹھتے تو خدا گناہ معاف کر دیتا '' جلال جب دونوں بھائیوں کو سٹیشن چھوڑ کر آیا تو بوا نصیبن نے بڑی حسرت سے کہا ۔

''یہ دوائیں نہیں بند ہوں گی ۔ ان کم بختوں نے ہی دم اڑکا رکھا ہے''۔ بارھویں دن خالہ بی نے جلال کے ہاتھ سے دوا کی بوتل چھین لی اور چلمچی میں انڈیل دی ۔ '' ارے اب تو ایک نیکی کرو ۔ بس اب مر جاؤ '' خالہ بی دادا جان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر رو دیں ـــ''انہیں موت نہیں آنے کی ۔ یہ نہیں مرینگے۔''

''خالہ بی ـــ'' جلال چیخ پڑا ۔ اور خالہ بی روتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں ۔ جلال نے یخنی کا ایک چمچہ دادا جان کے خر خراتے ہوئے گلے میں ڈال دیا ۔ اُن کی آنکھیں جیسے بہت گہرے سوراخوں میں پڑی ٹمٹما رہی تھیں۔

جلال کرسی سے اٹھ کر دادا جان کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا ۔

'' دادا جان '' ـــ جلال نے بڑے ہولے سے پکارا ـ
'' دادا جان '' وہ ان کا ہلتا ہوا ہاتھ تھام کر سہلانے لگا ۔ '' سب آپ کو برا کہتے ہیں ۔ سب چاہتے ہیں کہ آپ مرجائیں مگر دادا جان کوئی نہیں جانتا کہ آپ کی موت میری زندگی کو ایک بہت بڑا دکھ دے جائے گی '' وہ بڑے پیار سے انہیں دیکھنے لگا ۔ تاریک سوراخوں میں پڑی ہوئی آنکھیں اس کے چہرے پر جم گئیں ـ '' کون کہتا ہے آپ نے زندگی میں کوئی نیکی نہیں کی ۔ آپ کی نیکی کی ایک زندہ مثال تو میں خود ہوں ۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میں تین سال سے

آپ کے گھر میں ہوں، آپ کے پیسے سے میں نے پڑھا ہے آپ کے گھر میں کھاتا ہوں، آپ نے ہی ہمیں بھیک مانگنے سے بچا لیا۔ اب میں تعلیم ختم کر کے اس لائق ہو چکا ہوں کہ اچھی سی ملازمت کرلوں اور" ۔ وہ ایک لمحے کے لئے جھجک کر چپ ہو گیا ۔ " اور ایک پورا خاندان آپ کی نیکی کی وجہ سے پروان چڑھے گا ۔ آپ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا ۔ آپ کو اس نیکی کا اجر ضرور ملے گا" اس کے چہرے پر جمی ہوئی آنکھیں آہستہ بند ہونے لگیں دادا جان کے وحشت ناک چہرے پر عجیب سا سکون چھا رہا تھا۔

" دادا میاں، آپ کتنے اچھے انسان ہیں، آپ نے کتنی بڑی نیکی کی ہے" دادا جان نے بڑی دقت سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اور پھر ان کے ہونٹ مسکرانے کے لئے کھل گئے۔ " خالہ بی جلال کو آواز دے رہی تھیں۔ وہ جلدی سے باہر نکل گیا ۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ بوا نصیبن صحن میں پڑے ہوئے پلنگوں پر بستر لگا رہی تھیں۔

" ارے لڑکے اپنے خالو کے خیال سے اس طرح کیوں جان مار رہا ہے، نصیب دشمناں کہیں تجھے کچھ ہو گیا تو میں کہیں کی نہ رہونگی" ۔ اس کی امی نے چپکے سے ڈانٹا ۔ "بس جب خالو گھر میں ہوا کریں تو انہیں دکھانے کے لئے دادا جان کے پاس چلا جایا کر۔ وہ جانے کب تک نہ مریں ۔ تیری صحت دو کوڑی کی نہ رہے گی"۔

" یہ تو دیوانہ ہو گیا ہے" خالہ نے بھی گھرکا۔

دادا جان کے کمرے میں کلوا کی ڈیوٹی لگا کر سب سو گئے۔ صبح تڑکے تڑکے خالہ بی کے چیخنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ "ارے کوئی ان کو بتاؤ کہ ابا میاں کا انتقال ہو گیا"۔

اگر آپ کو یہ دیکھنا ہو کہ اردو تنقید ارتقا کی کس منزل پر ہے تو

تہذیب و تحریر

ملاحظہ فرمائیے

تہذیب و تحریر مجتبیٰ حسین کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے ۔ ان میں سے ہر مضمون ادب کی ایک زندہ تعبیر اور تنقید ہے ۔

مجتبیٰ حسین اردو کے نہ صرف جلیل القدر ناقد ہیں بلکہ ایک صاحب طرز ادیب بھی ہیں ان کے تنقیدی مضامین میں ادب کے بارے میں ایک نئی نظر اور ایک راہ دیتے ہیں ۔

مکتبہ افکار کراچی

ابوالفضل صدیقی

مفت کی

کل میں نے اللہ بخشے حکیم جی کے مرنے کی خبر سنی تو کچھ عجیب رومانٹک سا دھچکا لگا بہتیرا روکی مگر کم بخت ہونٹوں پر مسکراہٹ آہی گئی، جیسے شوخ یادوں کا ایک رنگیں سے ریلے میں لڑھک کر تیس سال پیچھے جا پڑا اور دلی سے واپس ہوتے ہوئے چلتی ریل میں تنہا کمپارٹمینٹ کے اندر پہلے تو مرحوم سیفٹی ریزر کے بلیڈ سے خود اپنے ہاتھ سے اپنی واسکٹ کی خالی جیب کاٹتے ہوئے آنکھوں کے سامنے گھوم گئے اور پھر یاد کے نہاں خانہ سے جیسے مرحوم کی مری مری آواز میرے کانوں کے اندر گونجی ”ہاں دیکھو اب ٹھیک رہی نا؟ بس یہی، ہوں، اہا حفت کو دکھادونگا، ویسے کوئی بات نہیں شاید وہ تم سے پوچھینگے ضرور، ہوں، اور تم میری بات کی تصدیق کر ہی دوگے“ ”ہاں“ اور میں نے قرارداد کے مطابق اثبات میں سر ہلایا، اور انہوں نے جھینپی جھینپی نگاہیں جیسے کوشش کرکے اوپر اٹھائیں اور میرے چہرہ پر گاڑ کر بولے ”دیکھو یہ میرا راز ہے، اور تم میرے ہمراز ہو، ہوں، آں، زندگی بھر کسی سے نہ کہنا“۔

اور میں کچھ مذاق کے موڈ میں آگیا اور چہرہ پر مزاحیہ سنجیدگی پیدا کرکے بولا ”ہمراز! ہم راز تو خیر آپ کی ’آوں، وہ ہیں، وہ کون ہوئیں آپ کی . . .“ اور حکیم جی کے چہرہ پر ایک رنگ سا آگیا، اور میں نے بات کا رخ ذرا دوسرے مزاح کی

جانب پھیر دیا اور کہا " ہوں ، خیر چھوڑو ، ہاں تو پھر حکیم جی اپنی زندگی بھر یا تمہاری زندگی بھر ؟ "

اور حکیم جی نے اپنی سنجیدگی کو مضبوط تر بتاتے ہوئے میرے موڈ کو دبانے کی کوشش کی اور فرمایا " کم از کم میری زندگی بھر ، اوں ، آں ، اور اپنی زندگی بھر کا پھر تمہیں اختیار ہے "

اور میں نے سنجیدہ ہوکر جواب دیا " ارے یار تم مجھ سے یہ کیا کہہ رہے ہو بار بار ، بھلا سوچو تو تمہارے تو فرشتوں کو بھی نہ سوجھتی میں نے خود ہی تو ، ترکیب بتائی اور میں ہی بھلا کہتا پھرونگا ۔ "

اب سے چالیس سال پیشتر حکیم جی میرے ہم مکتب تھے ، اور وہ جب بھی حکیم جی پکارے جاتے تھے ، سب ساتھی حتیٰ کہ فہمائش کے وقت بھی میاں جی گرج کر انہیں حکیم جی ہی پکارتے حکیم جی مادرزاد قسم کے نسلی حکیم جی تھے باپ دادا پردادا سب حکیم جی ہی چلے آرہے تھے ، اور حکمت سے حکیم جی کا تعلق دروازہ کی لونڈی جیسا کچھ پشتی سا چلا آرہا تھا ، — حکیم جی ، حکیم جی ہی پیدا ہوئے ، حکیم جی ہی پلے بڑھے اور آج حکیم جی ہی مرے "

مکتب سے نکل کر میری اور حکیم جی کی تعلیم کے دھارے دو متضاد سمتوں کو بٹ گئے ۔ انہیں بڑے حکیم جی نے صرف ونحو کا فیہ شرح ملا پڑھا کر عربی کی کچی پکی تکمیل کرائی اور پندرہ سولہ سال ہی کی عمر تک گھر پر طب پڑھا کر " بقلم خود " تکمیل طب کی خانہ ساز سند لکھ کر دیدی ، — اور " حکیم الحکماء ، فخر اطبائے یونان ، محافظ جان مریضاں ، نازش لقمان ، ارسطوئے دوراں ، مسیح شہر ، حاذق دھر ، جالینوس وقت ، سینائے بخت جناب حکیم جبار الدین صاحب مدظلہ عالی فاضل الطب والجراحت ، ماہر خصوصی امراض پوشیدہ زنانہ و مردانہ ، وطفلانہ وغیرہ وغیرہ " جلی قلم بورڈ لکھوا کر اپنے بورڈ کے برابر آویزاں کرادیا اور اپنے تخت کے سامنے تخت ڈالکر مسند تکئے لگا کر ان کی مسند طب بچھادی ۔ اور بھلا مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھائے ؟ بس ایک اور ایک گیارہ بن کر مطب چل پڑا ۔ اور مرنا جینا دوھی تو باتیں ھوا کرتی ھیں

ملک‌الموت کو اور بھی آسانی ہو گئی، پہلے تو کبھی کبھی بڑے حکیم جی سے تھوڑی بہت جد و جہد ہوا بھی کرتی تھی، اب بڑے حکیم جی سے کنی کاٹ کر چھوٹے حکیم جی کی آڑ میں پوری پوری مطلب براری کرلیا کرتے اور نبض حکیم جی کے ہاتھوں میں رہ جاتی اور مریض کی گردن عزرائیل کے پنجے میں پہنچ جاتی۔

حکیم جی میں بچپن ہی سے خمیرہ مروارید جیسی لطیف مٹھاس اور شیرہ عناب جیسا بے داغ رنگ جھلکتا تھا، جو عنفوان شباب ہی میں دواء المک معتدل کے مزاج میں ڈھل گیا، اور جس وقت پہلی مرتبہ جمعہ کے روز بڑے حکیم جی کے سامنے عمائدین کر شہر کے ایک چھوٹے سے اجتماع میں جو بڑے حکیم جی کی دعوت پر منعقد ہوا تھا مسند طب پر جلوہ افروز ہوئے تو میری نگاہوں کے سامنے تاریخی کہانیوں کی کتاب والی وہ تصویر گھوم گئی جس میں شہنشاہ شاہجہاں اور ولیعہد داراشکوہ ساتھ ساتھ جاؤس کئے آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے دکھائے جاتے ہیں۔ اگرچہ نیم حکیم کے خطرے کے مارے مرتے دم تک میں نے کبھی حکیم جی کے ہاتھ میں نزلہ زکام میں بھی اپنی نبض نہ دی پھر بھی نہ معلوم کیوں ساری عمر مجھے ان سے ایک لگاؤ سا رہا ویسے بظاہر میرے ان کے درمیان کوئی ایک قدر بھی مشترک نہ تھی۔ ممکن ہے کہ یہ لگاؤ اس شدید تفاد کا ہی رد عمل رہا ہو جو داخلی اور خارجی ہر صورت سے میرے ان کے درمیان نظر آتا تھا کیسا مکمل تفاد! ہر پہلو سے ایک دوسرے کا جواب اور نفی ہی نفی، — انہیں طب کی تعلیم دے کر خانہ ساز عطاری اور دوا فروشی سکھائی گئی اور مجھے سرے سے طب یونانی ہی پرانی دقیانوسی دواسازی بتائی گئی تھی، مجھے مکتب سے اٹھا کر کانونینٹ اسکول بھیجا گیا تھا انہیں عربی فارسی کی نامکمل چلتی ہوئی تعلیم دی گئی تھی۔ لہذا تربیتی ماحول کے جو خارجی اثرات رونما ہرتے وہ ظاہر تھا، — سر سے چلئے میرے بال البرٹ فیشن کٹنگ کئے ہوئے حکیم جی کے سر پہ پٹھے، ان کے منہ پہ بھرابھر جوانی داڑھی جو خدانکرے استرے کی زد تو درکنار مدتوں قینچی کی دسترس سے بھی باہر رہی، ریشمیں بگلی بگلی، مستقل ریشہ خطمی سی، یک مشت دو انگشت، نور ہی نور! فرشتے جس میں جھولا جھولیں اور حوریں خلال کریں، جیسی سبزہ

آغازی میں آگی تھی ویسی ہی بڑھی چلی آرہی تھی، نرم نرم سلامت روی کی چال، — اور یہاں روز کا روز بلا ناغہ علی الصبح اور کسی کسی روز صبح شام دونوں وقت سیفٹی ریزر سے کھرچنے کھرچتے مونہہ جیسے چھلا چکوترہ سا، حکیم جی کا کلہ ہمہ وقت متحرک اور جبڑہ تہ بہ تہ پانوں سے پر اور یہاں اگر صرف چبانے کے لئے کبھی کوئی چیز چبائیں تو چیونگ گم، — ان کے بدن پر نیچی اچکن چوڑی دار پائجامہ گلے میں رومال پاؤں میں دلی کی ھلکی جوتی سرپہ بھاولپوری سلک کا عمامہ، — گرمیوں میں اسکی جگہ دوپلی مری چکن کی ٹوپی لے لیتی، بدن پر شبنم کا باریک انگرکھا اور ململ کا کرتہ ھوتا، ٹانگوں میں لٹھے کے پورے عرض کا تمان آجاتا اور ھمیشہ سیدھے ھاتھ میں چاندی کی منقش موٹھ والی موٹی چھڑی ھوتی اور الٹے ھاتھ میں ڈھولی بھر پانوں کی گلوریاں بھری مراد آبادی ڈبیہ ھوتی اور موٹا تازی بھاری بھرکم زرکار مخملی بٹوا ھوتا چھالیہ تمباکو قوام سونف ناریل ملیٹھی پیپرمنٹ اور چونے والی نہ معلوم کن کن چیزوں سے پر — یہاں وائٹ وے لیڈلا کارخانے کا سلا ھوا سوٹ پہنے سر پہ چوڑی باڑ کا فیلٹ ھیٹ لگائے پاؤں میں چرمراتا بوٹ ڈانٹے ھاتھ میں پتلا ایڈی پولو پکڑے، مونہہ سے ٹوئن بجاتے اینڈتے دکھائی پڑا کرتے ۔ اور بولتے وقت اردو میں لپٹی انگریزی میں بات کیا کرتے ۔ اور حکیم جی گفتگو کرتے وقت فارسی کی نا مانوس ترکیبیں اور عربی کے غریب و ثقیل صیغے نطق کے مرتبان سے نکل نکل کر مونہہ کے اندر بھری ھوئی معطر پیک میں رب السوث کی طرح آملتے ۔ اور مونہہ کے اندر ھی اندر اگال کو معجون مرکب بنا دیتے اور ھونٹوں سے بات مفرح مشکیں سی ھوکر نکلا کرتی ۔

میرے ٹائپ کے لوگ حکیم جی سے اور حکیم جی کی وضع کے بزرگ مجھ جیسے لوگوں سے کترایا کرتے ھیں، مگر خیر حکیم جی تو دکاندار تھے ان کی تو کچھ نہ کہئے لیکن مجھے اپنی اور حکیم جی کی اتنی مکمل ضد میں ایک لگاؤ سا محسوس ھوتا، اور بچپن کی ھم مکتبی کی روایت کا سہارا لے کر میں ان سے بے تکلفی کے ساتھ ملتا حالانکہ وہ اپنی مخصوص تربیت اور معاشرہ کے تقاضے کے بموجب اپنی جانب سے تکلف اور تصنع کی حدود پار نکرتے، جب کبھی

ادھر گزر ہوتا تو ان کے مطب میں دو گھڑی کے لئے ضرور جاتا، اور میں تو نہایت بے تکلفانہ انداز میں گویا جا دھمکتا مگر وہ نہایت پرتکلف انداز میں ہاتھوں ہاتھ لیتے اگر گرمی کا موسم ہوتا تو نہایت اہتمام کے ساتھ شربت راحت روح سے نوازتے جاڑے ہوتے تو مفرح عنبریں سے تواضع کرتے اور چلتے چلتے بڑے اصرار کے ساتھ پان کھلا کر مفت میں میرا مونہہ لال کر دیتے مگر اس تمام تصنع اور وضع داری کے رویہ کے باوجود مجھے نہ معلوم کیوں انکی صحبت میں دلکشی اور عمل میں دوستی سی محسوس ہوتی۔ شاید اسمیں بزرگوں کی اس نصیحت کے مطابق تحت الشعور کے اندر کچھ مصلحت کو دخل تھا کہ شہر کے حاکم اور حکیم سے دوستی رکھو" ــ مگر شہر کا حاکم تو یاری پالتا نہیں ھے لہذا پوری کی پوری دوستی حکیم جی پر ختم ہوگئی تھی۔

(۲)

میری عمر سولہ سترہ سال کی اور حکیم جی بھی سترہ اٹھارہ سال کے رہے ہونگے، اکتوبر کا آغاز تھا، اور مجھے کارتوسوں کی خرید کے سلسلہ میں دلی جانا تھا، اتفاق سے حکیم جی بھی دوائیں خریدنے دلی جارہے تھے، میں سٹیشن پر پہلے پہنچ گیا تھا اتنے میں حکیم جی قلی پر اسباب لدوائے نظر آئے اور رستہ کاٹنے کے لئے مجھے خواجہ خضر کی طرح معلوم ہوئے لپک کر استقبال کیا علیک سلیک کے بعد میں نے کہا "کہاں جارہے ہو حکیم جی، کیا دلی"؟

"جی ھاں دھلی، دھلی، اور آپ؟ آپ بھی شاید، ایں"؟

"ھاں بس یار خوب ساتھ ھوا چلو رستہ اچھا کٹجائیگا سوچ ھی رہا تھا کہ کوئی مل جائے تم بڑے اچھے آئے"

"ھوں، خوب، مگر آپ کس سلسلہ میں تشریف لئے جا رہے ہیں؟" انہوں نے پان پیش کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"اماں شکار کا سیزن شروع ھوگیا نا، بس یاروں کا اور کیا کام ھوتا، لانگ رینج کارتوس خریدنا ھیں"

"اچھا کارتوس خریدنے دھلی!؟ ــ کیا کارتوس یہاں دستیاب نہیں ھوتے؟"

"ملتے تو یہاں بھی ہیں مگر پہلے تر مہنگے اور پھر لانگ رینج نہیں ملتے وہاں چیز بھی بڑھیا ملے گی اور سستی بھی، آنے جانے کا خرچ بھی نکل آئے گا اور پھر بھی بچت رہے گی، اور تم، تم تو شاید دوائیں لینے جاتے ہوگے"

"جی ہاں، جی ہاں، مفردات خصوصی" ۔ حکیم جی نے پان چباتے ہی چباتے بغیر مونہہ روکے ہوئے کہا۔

"یہ کیا دوا ہوتی ہے یار" میں نے اپنے مخصوص بے تکلف انداز میں سوال کیا۔

حکیم جی کچھ مسکرائے سے اور حکیمانہ انداز میں فرمایا "اجی حضت یہ ایک چیز نہیں بہت سی ادویہ ۔۔ مشک، زعفران، عنبر، ورق طلاء، زہر مہرہ خطائی، مروارید، مایہ شتر اعرابی، کف ابابیلی اور مختلف جراھرات کی کھڑ، وغیرہ وغیرہ مفردات خصوصی، ایک ہزار روپیہ کی خرید کرنی ہیں۔"

"ٹھیرو گے کہاں یار ؟"

"حضور میں تو پہلی مرتبہ جارہا ہوں تنہا، ورنہ ہر سال ابا حضت خود تشریف لے جایا کرتے تھے، اس مرتبہ اس خیال سے کہ سفر موجب تجربہ و محد عقل ہوتا ہے مجھے متعین فرمایا ہے اور ایک ہزار روپیہ کی رقم حوالہ فرما کر صرف اتنا حکم دیا ہے کہ مفردات خصوصی جو دواخانہ کے مرکبات کا جزولا ینفک ہیں بہ نفس نفیس خود خرید کر لاؤ ویسے میرے علم میں بر سبیل تذکرہ یہ چیز ان سے پہنچی ہے کہ وہ صادق حسین صاحب ایجنٹ ہمدرد دواخانہ کے یہاں ہمیشہ قیام پذیر ہوتے رہے ہیں اور صاحب موصوف ہی کی معرفت ہمیشہ تھوک نرخ پر خریداری فرمایا کرتے تھے ان کا مکان محلہ بلی ماران میں ہے میرا ارادہ ہے کہ میں بھی سیدھا وہیں جاکر قیام پذیر ہوؤں اور والد بزرگوار کے معمول کے مطابق انہیں کی معرفت خریداری کروں ویسے چونکہ انہوں نے مجھے آزمائش کے طور پر بھیجا ہے لہذا کوئی ہدایت نہیں فرمائی ہے ۔ اور جناب کا قیام کہاں ہوگا ؟" اور میں نے اپنے مخصوص بے تکلف لہجہ میں جواب دیا "یار تم جانتے ہو کہ اینجانب تو دولت پھونکنے جارہے ہیں، کارتوس خریدنے، سو بھئی تین سو نقد تو پپا نے دیئے ہیں اور سوا سو یار لوگ مار کر لائے ہیں پورے پانچ

اگلے "فورٹوئنٹی" ـ اور اپنے سینے پر آہستہ سے ہاتھ مار کر سلسلہ کلام جاری رکھا "سو پپا نے تو ڈھائی سو روپیہ کارتوسوں کے اور پچاس سفر خرچ کے دیئے ہیں مگر بندہ، درگاہ گھر سے بجٹ بنا کر چلے ہیں، پچیس آنے جانے میں خرچ کرینگے اور اپنے ڈیڑھ سو روپیہ کے سپر ایکس لانگ رینج ان سے علیحدہ اپنے چرا کر لے جائینگے یہ سفر کی دو چار دن کی ذرا سی بات ہے، تکلیف سہی تھوڑی سی، مگر سیزن خوب کٹے گا دنادن، اور کچھ تکلیف بھی نہیں میں تو پنڈت کے کوچہ میں ایک دوست، مربی، بزرگ جو کچھ بھی کہو ان کے یہاں ٹھیرونگا آدمی مخلص ہیں یہاں چھوٹی موٹی تجارتیں کرتے ہیں، خوب خوشحال ہیں اور بڑے متواضع ویسے تو انہیں ہم سب "چچا مرحوم" کہتے ہیں مگر بڑے زندہ دل آدمی ہیں سمجھ لو کہ سبھی کے یار ہیں، والد، تایا، بڑے بھیا، اور چھوٹے بھائی کیا بھتیجوں بھانجوں سب سے یکساں بے تکلف ہیں اور سب کے ساتھ ایک رفتار گھل مل کر ملتے ہیں مزیدار وضعدار لوگ ہیں، اپنے سانچے کے بس خود ہی۔"

اور ہم دونوں انٹر کلاس میں بیٹھ گئے ۔ سہ پہر سے مغرب بعد تک مسافر چڑھتے اترتے رہے اس زمانے میں گاڑیوں میں اتنا ھجوم نہیں ہوا کرتا تھا نو بجے رات تک ہم کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو چودہ آدمیوں کی لکھی ہوئی گنجائش کے درجہ میں ہم دو رہ گئے تھے ۔ حکیم جی عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے، ٹرین ہردوئی کے ارد گرد کسی چھوٹے سے دیہاتی سٹیشن پر پلک مارتے ٹھہری اور ایک مرد اور ایک لڑکی اندر داخل ہوئے ۔ حکیم جی تو فرض پڑھ کر خصوع و خشوع کے ساتھ دعا مانگ رہے تھے، میں نے دونوں کو گہری نگاہ سے بھانپا، اور اتنی مختلف وضع قطع میں ساتھ ساتھ ہونے پر پہلی نظر میں ھی میرا ماتھا ٹھنکا اور پھر حیرت سی ہوئی جب میں نے غور کیا کہ بجز ایک چھوٹی سی پوٹلی کے جو مرد کی بغل میں دبی ہوئی تھی ان انٹر کلاس کے مسافروں کے ساتھ کوئی اسباب نہ تھا حتیٰ کہ بستر بھی نہیں، ۔ گاڑی چل پڑی اب میں نے پہلے مرد کا جائزہ لیا ساتھ ھی ساتھ شعوری اور غیر شعوری طور پر لڑکی کے اوپر بھی کبھی چھچھلتی اور کبھی گہری نگاہ پڑتی رہی اور مرد کے حلیہ وضع قطع کو لڑکی کے ساتھ منطبق

کر کے ایک دوسرے کے تعلق کا کھوج لگاتا رہا اور جوں جوں نظر غائر ہوتی گئی میں اُلجھتا ہی چلا گیا ۔

مرد کے بدن پر شارٹ کوٹ تھا ، ذرا نیچا پرانا ، گھسا ہوا میل خوردہ ، مسخ شدہ اونی سرج کا جو اترن معلوم ہوتا تھا سر کے اوپر کشتی نما چیکٹ چڑھی ہوئی ٹوپی دھری تھی، جس کے کپڑے کی قسم کا یا اصلی رنگ کا سراغ چلانا بھی مشکل تھا ، شاید بھوری رہی ہو یا کتھئی یا بادامی کیسی ہی - ٹوپی میں سے آگے کو تنگ پیشانی کے اوپر چھجے کی طرح نکلے ہوئے بال تھے سخت ، چمکدار ، سیاہ ، جیسے تاروں کا گچھا سا پچکی کنپٹیوں اور سر کے پچھلے حصہ پر زیرو نمبر کی مشین گھومی ہوئی تھی اور ناریل سی کھوپڑی پیچھے کو نکلی ہوئی تھی ، موٹے موٹے بڑے بڑے کانوں میں چاندی کی بھدی مرکیاں جھول رہی تھیں، چہرہ کے زیریں حصہ اور گردن کے گرد ایک بھورا بھورا سا کثیف جھاڑن لپٹا ہوا تھا - ٹانگوں میں میل خوری اوٹنگری سی دھوتی تھی جو معلوم ہوتا تھا کہ نہ معلوم کتنے عرصہ بعد دھوئی گئی ہے کہ محنت کے ساتھ ہاتھ سے دھونے کے باوجود بھی کثیف سی تھی جیسے جگر میں میل گھسکر رہ گیا تھا - اور بہت کوشش کے ساتھ سلیقہ سے باندھنے کے باوجود بمشکل اک ذرا گھٹنوں سے نیچے اتر سکی تھی - پاؤں میں ادھوڑی استر کا جوتا تھا جس پر تیل اور مٹھا ملا ہونے کے سبب گرد کی تہ نہایت مضبوطی اور دبازت کے ساتھ چپکی ہوئی تھی - لڑکی تو سمٹی بٹلی چری چری رہی مگر مرد نے ڈبہ میں داخل ہوتے ہی جیسے کچھ اجنبی تیوروں سے جائزہ سا لیا ، - چہرہ کے گرد لپٹا ہوا جھاڑن ہاتھ میں لیکر پھڑاپھڑ جوتوں اور پنڈلیوں پر مار مار کر چمٹی ہوئی گرد جھاڑی اور پھر ڈبہ کے اندر چاروں طوف اور اوپر نیچے کچھ ایسی اجنبی اجنبی غیر مانوس سی نظریں پھینکیں جیسے آج پہلی مرتبہ ”ڈیوڑھے درجہ“ میں سفر کرنے کے لئے داخل ہوا ہے اور گدے دار نشست پر بیٹھتے ہوئے جھجھکتا سا ہے ، - حکیم جی میرے بازو والی برتھ پر نماز پڑھ رہے تھے اور وہ دونوں عین میرے سامنے تیسری خالی برتھ پر بیٹھ گئے - او اب میں نے اطیمنان کے ساتھ معائنہ سا کیا ، سیاہ تاب سخت و کرخت چوکھونٹے سے چہرہ کا آدمی تنگ ڈھائی انچی

پیشانی دونوں جانب رخساروں کے ہڈے اٹھے ہوئے گال قدرے پچکے ہوئے، پرانے مہاسوں کے مارے کھترے کھترے سے تھے، خوب لٹکی ہوئی پتھر کی بٹیا سی سے ٹھوڑی اور دونوں جانب مضبوط مضبوط سے نکلے ہوئے پتھریلے اور کالے جیسے سلاخوں بھری موٹی گردن جسکے گرد لال ڈورے میں بندھی چاندی کی چھوٹی سی تختی سامنے لٹک رہی تھی، جب گھنی گھنی چوڑی چوڑی جٹی ہوئی بھوؤں کے تلے ننھی ننھی کینڑی کینڑی آنکھوں سے بغیر گردن ہلائے ادھر آدھر نظریں پھینکتا تو اندر سے بھیڑیئے جیسی چمک کی چھوٹیں سی چٹخ اٹھتیں اور جب ذرا ٹھہرتیں تو مجموعی طور پر دونوں آنکھیں چہرہ کے اوپر ایسی معلوم ہوتیں جیسے تمبا کو کے پنڈے میں گٹھیا کوڑیاں جڑی ہیں۔ گدھا سی کلائیاں اور ستون سی پنڈلیاں، جن پر آٹھ دس دن کا استرا پھرا معلوم ہوتا تھا اور سخت رونگٹا سوئیوں کی طرح کھڑا ہوا تھا، موٹی سخت انگلیاں گھسے گھسے سے ناخن، بائیں چھنگلی میں چاندی کی رگڑی رگڑی سی انگوٹھی تھی اور دونوں ہتھیلیوں کے اوپر ٹھیٹھیں اور رگڑیں تھیں پہنچوں اور پنڈلیوں پر جگہ جگہ ابھری ہوئی نسوں کے گچھے اور گلٹیاں سی نمایاں تھیں — اور جیسے یہ آہنی ہاتھ پاؤں، پنڈلیاں راتیں اور فولادی پنجے بازو پتھریلے کولھوں اور سنگیں سینہ میں لگے ہوئے تھے جو موٹے کوٹ اور دھوتی میں لپٹے ہونے کے باوجود بھی چٹان کی طرح نمایاں تھے۔ عمر پچیس تیس سال کے درمیان ہوگی مگر جیسے کچھ سخت کوشیوں اور شدید محنت کے تسلسل سے تمام وجود پر پینتیس چالیس سالہ روڑھا پن پیدا ہوگیا تھا، بہت کچھ سنبھالے سا بیٹھا تھا مگر بشرہ میں گہرا انتشار تھا، جو بار بار چہرہ اور آنکھوں میں وحشت بن کر ابھرتا اور کبھی کبھی تو اس حد تک نمایاں ہوجاتا کہ معلوم ہوتا کہ کہیں چلتی ریل میں سے جست نہ لگادے۔ اون اور ریشم کی پوٹلی سی بنی لڑکی ذرا علیحدہ کو دبکی ہوئی تھی ستھری کشمیری شال میں اچھی طرح لپٹی ہوئی خوب لمبا گھونگھٹ نکالے، شال کے نیچے باریک ململ کا دوپٹہ تھا جس کا کنارہ کبھی گھونگھٹ سے اور کبھی ادھر ادھر کسی اور جانب سے نظر آجاتا تھا ریشمیں کامدار لہنگا پہنے ہوئے تھی، نہایت احتیاط کے ساتھ بیٹھی تھی، دو ایک مرتبہ ادھر سے

ادھر پہلو بدلے تو ھاتھ نظر آئے اور ھاتھوں کی جھلک پر میں نے اندازہ کیا کہ بہت ھی کم عمر ہے، چھوٹے چھوٹے گورے گورے ھاتھ جن میں بچکانہ پن جھلکتا تھا اور جب ایک مرتبہ کھڑے ھوکر اور شال دوپٹہ درست کر کے اک ذرا اپنی نشست بدلی تو کچھ سراپے سے ایسا اندازہ ھوا کہ جیسے بچپن کی سرحد سے نکل کر جوانی کے حدود میں پہلا قدم رکھ رھی ہے۔ اور جب تک حکیم جی نے نماز سے فارغ ھوکر ایک تسبیح ختم کی اتنی دیر میں ان دونوں کے متعلق میرے اندر نہ معلوم کتنے سوال ابھر گئے ۔ ھر چیز معمہ سی ، وضع قطع، صورت شکل ، عمر بہر حال ھر پہلو بے جوڑ۔ اسباب ندارد یہاں تک جاڑوں کا موسم اور بستر بھی نہیں پھر بھی رات گئے ایک دیہاتی سٹیشن سے سوار ھونا ، اس کے جوتوں اور پنڈلیوں پر اور اس کی چپلوں اور لہنگے کے گھیرے پر گرد کی تہ ، جس سے صاف ظاھر تھا کہ پیدل منزل مار کر چلے آ رہے ھیں ، ریل میں چڑھے تو دونوں ساتھ ساتھ لیکن اندر آنے کے بعد ایک نے دوسرے سے بات کرنا تو در کنار ادنیٰ اشارہ یا ھلکی سرگوشی بھی نہیں کی جیسے سب کچھ بات کر کے چلے ھیں ، پھر مرد کے بشرہ کا انتشار اور لڑکی کے سراپے پر یک گونہ اطمینان ھر چیز شبہ میں ڈالنے والی تھی اور بڑی حد تک تضاوی تضاد نظر آتا تھا — اور میں نے اندازہ کیا کہ کچھ بھی ھو اس آدمی سے اس لڑکی کو کوئی خاص مناسبت نہیں ھو سکتی یہ کسی اچھے مالدار گھرانے کی لڑکی معلوم ھوتی ہے اور یہ کسی اسی قسم کے گھرانے کا ادنیٰ نوکر ، کہار ، نائی چمار ، بار بردار ، یا خدمتی رسویا ، باورچی مشعلچی و غیرہ اور تو کچھ نہیں حکیم جی کے ساتھ گپیں اور قیاس آرائیاں کرنے کے لئے خاصہ موضوع تھا مگر وہ بندۂ خدا تسبیح ھی پھیرتے رہے اور میں سو کر رہ گیا ریل نے ٹھہرنے اور چھوٹنے کا ایک جھٹکا لیا یا جیسے کچھ میرے اندر سے سوتے ھی سوتے جھٹکا سا ابھرا ، آنکھ کھل گئی ، کلائی پر نظر کی تو تین بج رہے تھے، ایک انگڑائی لے کر حواس میں آ گئے ، کچھ کان چونکے ، منہ پر ھاتھ پھیر کر اور ذرا آنکھیں مل کر جو کچھ دیکھا اس پر یقین نہ آیا ، پھر جلدی جلدی پلک

مار کر آنکھیں کھولیں جیسے تبضن کیا کہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں ، حیرت کے مارے دھک سے ہو گیا ، شروع شب کا معمہ اس وقت در معمہ بنا ہوا تھا سامنے حکیم جی تھے اور وہ !، حکیم جی کی پیہم سرگوشیاں اور لڑکی کی مسلسل سسکیاں میٹھی میٹھی مسکن سی سرگوشیاں اور کڑوی کڑوی ٹھنڈی ٹھنڈی گہری سانسوں میں ، سسکیاں ، ادھر سسکیوں تھرتھراتے ہوئے دو چار لفظ اور پھر کانپی ہچکانے سی سسکیاں - اور سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان حکیم جی کی ہمت افزا آواز اور مشفقانہ انداز اور شفقت کے ساتھ بار بار اس کا نازک ھاتھ اپنے ھاتھ میں دبا لینا گویا نبض دیکھ کر کسی بدحواس مریض کو تسلی دے رہے ھیں - اور اک ذرا نیند کے خمار سے دماغ آزاد کر کے میں نے سوچا اور اس کے ساتھ والے مرد کو تلاش کیا ، مگر وہ درجہ میں نہ تھا ، نہ اپنی آنکھوں پر یقین آیا نہ کانوں پر ھی اعتبار ھوا ، الٰہی یہ کیا دیکھ رہا ہوں !؟" اور حکیم جی تو میرے سامنے دو زانو بیٹھے تھے آسکی البتہ اک ذرا پشت سی تھی ، حکیم جی اور اس کی تقریب ملاقات ؟ کیا اس لونڈیا کے پیٹ میں درد اٹھ کھڑا ہوا جو حکیم جی سے رجوع کرنا پڑا اور حکیم جی کو آدھی رات دست گیری کرنی پڑی ؟، اور پھر وہ اس کے ساتھ والا مرد چلتی ریل میں سے کہاں گم گیا ؟! - اور جیسے میرے رونگٹے رونگٹے میں تحقیق گدگدا اٹھی ، لیکن حکیم جی تو مجھ سے رخ نہ ملا رہے تھے اور ڈھائی گز کے فاصلہ پر سامنے بیٹھے سرگوشیوں میں زیر و زبر تھے اور ھاتھوں کی مخصوص حرکت اور بات کرنے کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ پیہم تسلی دے رہے ھیں اور مونہہ سے پھول سے جھڑ رہے ھیں ، میں نے خیال کیا کہ حکیم جی مجھے سوتا سمجھ رہے ھیں لہذا بڑے زور سے کھنکھارا ، میری کھنکھار پر حکیم جی تو کچھ زیادہ متوجہ نہ ہوئے مگر اس نے اپنی پوری گردن موڑ کر گھونگھٹ میں سے ایک نظر دیکھا اور پھر جھٹ سے جوں کی توں ہو گئی یا بلکہ اور بھی زیادہ سمٹ بٹل گئی گھونگھٹ کے اندر سے مجھے اس کے چہرے کی تین چہارم

جھلک نظر آئی ۔ الاماں ! و الحفیظ !! بجلی سی چمک گئی میری آنکھوں کے، سامنے ، اور پھر رونگٹے رونگٹے میں سرور سا لپک گیا مگر میری مٹھار اور اس کے گردن موڑنے کے باوجود بھی حکیم جی نے آنکھ نہ ملائی ، البتہ میں نے اندازہ کیا کہ ذرا کچھ پرے کو کھسک رہے ھیں اور بات کرتے کرتے جو وہ بار بار اس کا ھاتھ تھام کر نباضی سی کرتے تھے وہ نہیں کر رھے ھیں ، میں نے تکیہ پر سے ذرا سر اٹھا کر گردن جھٹکی اور اشارہ سے استفسار کیا مگر حکیم جی نے آنکھیں ملانا تو درکنار کنکھیاں بھی سمیٹ لیں ، ۔ اب میں مستعدی کے ساتھ اٹھ کر اپنی برتھ کے اوپر پالتی مار کر بیٹھ گیا اور ھاتھ کھڑا کر اور بھوئیں آچکا کر اشارہ سے استفسار کیا اور خیر اب آنکھیں تو چار کرنی ھی پڑیں مگر پھر بھی حکیم جی نے ڈھٹائی کے ساتھ زبان ، یا اشارہ یا نگاہ سے میرے استفسار کو قبول نہ کیا تو میں نے اپنی مستفسرانہ حرکات میں شدت دکھائی اور ایک جھٹکے کے ساتھ بستر سے اتر کر ان کی جانب بڑھنے کا انداز بنایا ، میرے اس جارحانہ سے انداز پر حکیم جی کو اپنی ڈھٹائی توڑنا پڑی حکیمانہ سنجیدگی کو چھرہ پر برقرار رکھتے ہوئے وھیں سے انہوں نے ایک ھاتھ کا اشارہ کیا کہ "سب بتاؤں گا اطمینان رکھو" اور بدستور پان چباتے رھے، اور شاید میں بمشکل دو منٹ نچلا بیٹھا ھوؤنگا کہ میرے خون کے قطرہ قطرہ میں پھر بڑے زور سے تحقیق سنسنا اٹھی ، اور پھر وھی بندر کی سی اضطراری حرکتیں کرنے لگا اور بار بار اٹھکر ان کے پاس جانے کے لئے ھمکا ، ۔ شاید حکیم جی میری حدت تفتیش کا اندازہ کر کے ڈرے کہ مبادا یہیں رو در رو میرے اس کے درمیان نہ آ بیٹھے ، اور پھر جانتے تھے ڈھیلے ھونٹوں اور لمبی زبان والا لنگوٹیا یار ھے ، اور یوں اچھے بھلے مطب کے تحت مسند پر بیٹھے ھوئے بھی پھکڑ پن سے باز نہیں آتا ھے اگر اس وقت موڈ میں آگیا اور آدھمکا تو ساری رات کی کری کرائی پر دو جملوں میں پانی پھیر دے گا ۔ پان چباتے ھی چباتے بڑے زور سے کھنکھارے اور اٹھکر کھڑکی سے باھر

مونہہ نکال کر تھوکا اور حکیم جی کے ادھر ہوتے ہی اس نے بھڑکی ہوئی ہرنی کی طرح مڑکر مجھے پھر دیکھا اور ابکی مرتبہ بقیہ ایک چہارم چہرہ بھی کھل گیا۔ اور دو بیمار سی نرگسی انکھڑیاں جو رو روکر بھاری پوٹوں کے اندر گلابی ہو رہی تھیں میری مخمور اور متحیر آنکھوں سے چار ہو گئیں---- اور ساتھ ساتھ انگارہ سے دھکتے رخسار، گلاب کی پنکھڑی سے شاداب ہونٹ اور آئینہ سی دھکتی پیشانی، جس پر ایک کاکل کا گھونگھر بھٹک کر آ پڑا تھا، اور کیا کیا نہ معلوم، . . . سب کچھ سامنے آ گیا پورا کتابی چہرہ کھل گیا جس کے کچے کچے نقوش میں جوانی اور طفلی گلے مل رہی تھیں۔ یک ساعت تو میں بھونچکا سا رہ گیا پھر ذرا سنبھل کر سوچنے لگا مگر ان کفر ساماں لب و رخسار کے رنگین عکس اور پیشانی کے مجلد آئینہ میں حکیم جی کو دیکھنے کے لئے میرا دل تیار نہ ہوا، نمازی، متقی، پرہیزگار جوان صالح کیسے بدگمانی کروں، مگر سب کچھ سمجھنے کے باوجود سمجھنا وہی پڑا جو آنکھوں سامنے تھا، ۔ جب حکیم جی نے اچھی طرح تھوک کر کھڑکی سے سر اندر کیا تو میں نے اشارہ سے انہیں اپنی جانب بلایا مگر انہوں نے اطمینان کے ساتھ اچکن کی جیب سے پانوں کی ڈبیہ نکالی اور مخصوص نفاست کے ساتھ ایک گلوری کھائی - میں نے پھر بے صبر ہو کر اشارہ کیا اور آہستہ سے کہا "ادھر آؤ یار، کیا معاملہ ہے؟" اور میری آواز پر چونک کر اس نے پھر مجھے مڑکر دیکھا اور اب کی مرتبہ بھرپور نگاہیں چار ہوئیں، ایک مہمل سی سسکی سینہ سے اٹھکر میرے ہونٹوں پر تھرتھرا گئی۔ شاید حکیم جی اس سے میرا غائبانہ تعارف کرا چکے تھے میں نے پھر حکیم جی کو سرگوشی میں پکارا مگر انہوں نے، بدستور کھڑکی کے پاس کھڑے اسی شان استغنا جیسے مطب میں مسند پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ پان کے لوازمات کھایا کرتے تھے گلوری کے بعد بٹوے سے چھالیہ نکال کر ہتھیلی پر آہستہ آہستہ ملی اور کھالی، پھر الائچی کھائی اسکے بعد چونےدانی کھول کر چونا چاٹا اور اخیر پر قوام کی شیشی کھولی اور نقرئی چمچی سے

قوام کھایا، تب میری جانب متوجہ ہوئے اور میرے قریب آ کر کلہ بھرا مونہہ جھکا کے بولے ''کہئیے کیا فرما رہے تھے آپ؟''

کھول تو میں بڑی دیر سے رہا تھا، اس وقت کی اس شان استغنا اور نوعیت کلام پر پھنک گیا۔ دیکھو مسخرہ کی! نہ تو یہ اتنا بھولا ہے اور نہ میں اتنا احمق کہ مجھ سے اس معصومیت کے ساتھ یہ سوال کر رہا ہے، جیسے کوئی نئی بات ہی نہیں ہے، مجھے تاؤ سا آ گیا اور زہریلے تیوروں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''جی، جناب ابھی تک نہیں سمجھ پائے کہ میں کیا فرما رہا ہوں، کیوں یار ایسے بھولے بنتے ہو، یا ہمیں نرا گدھا ہی سمجھتے ہو ایں؟! خیر نہیں سمجھے تو سنو میں یہ پوچھ رہا تھا کہ یہ لونڈیا کون ہے؟ اور اس کا وہ، وہ کون تھا؟، وہ کہاں چلا گیا؟، اور جناب سے آدھی رات کیا راز و نیاز ہو رہے تھے؟، اور کچھ پوچھیں یا سمجھ گئے؟۔''

حکیم جی میرے انداز تخاطب پر ایک دفعہ کو تو کچھ بدحواس سے ہو گئے اور میرے کھلے کھلے چھلے چھلے جملوں پر کچھ جواب بن نہ پڑا اور بغلیں سی جھانک گئے، پھر ذرا سنبھلے اور پیک مونہہ کے اندر بھری ہوئے کے بہانہ کا سہارا لیکر ہکلاتی ہوئی زبان میں بولے ''ہوں، آں، اسی، بہ اے، اے ایک مصیبت زدہ لڑکی شریف خاندان'' میں نے سکوت کیا اور ایک منٹ خاموش منتظر رہا کہ کچھ اور تفصیل کریں اور جب میں نے اندازہ کیا کہ وہ میری بات کا اتنا ہی جواب کافی سمجھتے ہیں تو مجھے پھر جھرجھری آ گئی اور کہا ''یہ تو مجھے بھی نظر آتا ہے حکیم جی کہ لڑکی ہے لہنگا ہی جو پہنے ہے مصیبت زدہ ہے بیچاری رو رہی ہے، اور جاؤ تمہاری بات بھی مان لی کہ شریف خاندان ہے، مگر پتہ کی بتاؤ یار معاملہ کیا ہے، تم تو نماز پڑھ رہے تھے اور پھر میں سو کر رہ گیا میں نے ان دونوں کو چڑھتے ہی بھانپا تھا، اور میرا ماتھا تو اسی وقت ٹھنک گیا تھا کہ ہے کچھ دال میں کالا اس آبنوسی کندہ

ناتراش کی بغل میں دیکھکر ، ۔ مگر نہ اس کی شان نزول ھی سمجھ میں آئی اور نہ آپ کی اسوقت یہ تقریب ملاقات ھی عقل میں آئی ، ایں ؟؟''

حکیم جی میری سب اتارتے ہوئے نہایت مسکین انداز میں بولے '' عرض کیا نہیں بیچاری شریف ھے مصیبت زدہ ھے ، اوں ، آں ، اس ، ایں ''

'' اوں ، آں ایں ، شریف ھے مصیبت زدہ ھے وہ تو سب سن لی ، بات سیدھی سیدھی کرو اب اس وقت جو اس سے آپ سر گرم گفتار تھے تو کوئی نسخہ کی ترکیب استعمال تو بتا نہیں رھے تھے اور ساری رات جو کچھ بات ہوئی ہو گی اپنی کہی ہو گی اور دوسرے کی سنی ہو گی '' میں نے ذرا پھکڑ پن سے کہا ۔

حکیم جی ذرا مضبوط سے پڑے پیک نگل کر بولے '' پھر کیا اب ھماری پناہ میں ھے اور ھم اسکی مدد کریں گے ''

'' اڑو مت یار حکیم جی ، ۔ وھی بات تو میں دریافت کرنا چاھتا ھوں ۔ اس پر کیا مصیبت ٹوٹی جو آپ کے سایہ عالحضت میں پناہ لینی پڑی آدھی رات چلتی ریل میں '' اور حکیم جی نے پھر ایک گھونٹ سا لیا اور میں نے کہا ۔ '' تم نہ بتاؤ تو میں خود اسی سے جا کر پوچھ لوں کہ نیک بخت تجھ پر کیا مصیبت ٹوٹی جو حکیم جی کی پناہ میں آگئی '' ۔ اور یہ کہہکر میں نے اٹھنے کا انداز بنایا ، حکیم جی میرے دم خم سے زیادہ میرے پھکڑ پن سے مرعوب ھو گئے ، کندھے پکڑ کر برتھ پر دبا دیا ، اور میرے قریب بیٹھ گئے ۔ یوں بھی سمجھتے تھے کہ بات تو کھل ھی جائیگی ۔ کچھ کہنے کا انداز بناتے تھے اور کھل کر سامنے آنا چاھتے تھے مگر زھدوالتقا اور حکیمانہ سنجیدگی کے غلاف میں الجھ کر رہ رہ جاتے تھے ، میں نے نگاھیں ملا کر ایک آنکھ ماری ، یہ تو بھلی سونے کی چڑیا پھانسی یار اور اس سالے کا کیا کیا ؟ ، کیا چلتی ریل میں سے پھینک دیا ؟ کہاں گیا ؟ ، میں تو سو گیا تھا ۔

حکیم جی کا چہرہ یک دم ھموار ھو گیا ، ھونٹوں کے خم حکیمانہ سنجیدگی اور آنکھوں سے زھد والتقا کی ردت غائب ھو گئی

لب مسکرائے، گلوئے پھڑکے، اور آنکھیں چمک کر جیسے گنگنا پڑیں، اور اسی انداز میں جو عام طور پر ایسے مواقع میں مخصوص ہوا کرتا ہے کہا۔ ”اماں یار، آپ سے چھپاؤ بھی کیا ہے، ہردوئی کے مشہور صراف کی ناکتخدا لڑکی ہے پانی بھرنے والے کہار سے تعلق ہو گیا، معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں یوں ہی گھر کے اندر سلسلہ چلتا رہا۔ فرار کرنے کے لئے دم دلاسے اور ترکیبیں تو برابر دے رہا تھا مگر زیور نقدی پر لونڈیا کا ھاتھ نہ پڑا تھا۔ بتاتی تھی کہ کل آدھی رات سونے کا بہت سا زیور اور نہ معلوم کتنی اشرفیاں تجوری میں سے نکال لائی اور وہ نمک حرام پہنچا پھر بھگا لایا تمام دن اس سٹیشن کے قریب کسی گاؤں میں ایک مکان کے اندر دونوں بند رہے، رات کے شروع حصہ میں سوار ہو گئے۔ چند سٹیشن چل کر وہ پانی لینے کے بہانے اترا زیور کی پوٹلی بغل میں تھی پھر پلٹ کر نہ آیا، اور اس کا ٹکٹ اسکے پاس سیٹ پر رکھا چھوڑ گیا“۔

”آخر تم تو ساری رات باتیں کرتے رہے ہو، کیا بتاتی تھی کہ کیا منصوبہ بنا کر چلے تھے۔ میں نے کہا“

”کہ رہی تھی کہ یہ ارادہ بتا کر لایا تھا کہ یہاں سے دلی چلتے ہیں، اور وہاں سے پنجاب کے رجواڑوں میں نکل جائیں گے وھیں بس جا کر اور کچھ کاروبار کرینگے، اب اللہ جانے وھیں سے نیت بدلی ہوئی تھی یا راستہ میں بغل کے اندر سونے کی پوٹلی دبا کر خراب ہو گئی بہرحال وہ اسے بھگا کر لایا اور خود بھاگ گیا“ . . . .

حکیم جی کی سنتے ہی سنتے میں پھر عین اونگ کر رہ گیا آنکھ کھلی تو فجر کا وقت تھا گاڑی دھلی کے سٹیشن پر ٹھہر چکی تھی اور حکیم جی قلیوں سے اسباب اتروا رہے ھیں کچھ اسباب اتر چکا تھا اور وہ پلیٹ فارم پر کھڑی تھی، اور ابکی مرتبہ پھر نیا معمہ بنی ہوئی ترچھی ترچھی نظر بہتیرا کھلنے کی کوشش کرتی مگر باوجود سر و قد کھڑے ہونے کے بھی ویسی ہی سمٹی سمٹی پوٹلی سی رہ جاتی جیسی برتھ کے اوپر بیٹھی تھی۔ کنکھیوں سے دیکھنے کی کوشش کرتی، ایک مرتبہ جب مجھ سے نگاھیں چار ہو گئیں تو ایک ہی نظر میں پوری رات کے فسانہ کہ

گئیں مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اسوقت وہ باریک ململ کی سفید ساڑی میں ملبوس ہے اور وہ شال جس میں وہ سر سے پاؤں تک لپٹی ہوئی تھی اک ذرا ماڈرن انداز میں ترچھی ترچھی تہ کر کے کندھوں اور پشت پر ڈالے ہوئے ہے اور ململ کے دوپٹہ میں لہنگے اور شلوکے کی پوٹلی باندھے ھاتھ میں لٹکائے ہوئے ہے۔ میں حیرت میں رہ گیا تین بجے تک تو گٹھڑی سی بنی برتھ پر دبکی ہوئی تھی یہ دو تین گھنٹے میں نہ معلوم حکیم جی نے کیا پلائی کہ سب لپیٹ لپاٹ کر پوٹلی میں رکھ لیا۔ وہ شرمیلی شرمیلی لجاتی لجاتی سی نگاہیں نیچے کئے کھڑی تھی اور میں نے غور کیا معصوم نکلی اور بہکی جوانی کا بھولا پیارا امتزاج جسے ضائع شباب اپنی تمام رنگینیوں اور بوقاسونیوں سے چپکے چپکے سرین کر رہا ہے اور میں نے حکیم جی سے کہا " واہ دوست واہ ! یہ تو خوب کیچلی بدلوادی تم نے اور گھونگھٹ بھی اٹھا دیا ، اور ہم سوتے ہی رہے ، یار بڑے فطرتی معلوم ہوتے ہو۔ ایں ! یعنی ابھی پچھلے پہر تک شال اور لہنگا میں گٹھڑی بنی ہوئی تھی اور یہاں اک ذرا آنکھ جھپک گئی اور تم نے لہنگا بھی اتروا دیا اور ساڑھی بھی بندھوا دی اور بڑے زور سے قہقہہ لگایا اور حکیم جی نے منت کے ساتھ خاموش رہنے کو کہا۔

حکیم جی میرے چپکتے ہوئے سے دو معنی جملوں پر سٹ پٹائے آنکھوں میں خمیرہ شباب آور کی تندی اور نوشدارولوی کی مٹھاس جھلک رہی تھی ، مگر منہ سے گل بنفشہ ساجھڑا اور چہرہ کی سنجیدگی مضبوط تر کرتے ہوئے بولے " ہوں ، ٹھہرئیے ، وہ ، آں ، ایں " ذرا ادھر آئیے " اور میرا ھاتھ پکڑ کر ایک جانب کو لے گئے اور اک ذرا سکوت کیا آہستہ سے سنجیدہ مٹھار نکالی خاص انداز سے پان چبانے لگے جس سے چہرہ کی سنجیدگی فزوں تر ہو گئی۔ ایک گہری سانس ، لے کر فرمایا " اوں ، وہ ، دیکھئیے ایسا ہے نہ کہ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ جیسے بھی ہو سکیگا اسے اس کے گھر پہنچاؤں گا ، نیز مزید تسلی کے لئے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ میں اس کے باپ اور اہل خاندان سے واقف ہوں بلکہ یوں کہ معالج رہ چکا ہوں ، آں ،

اور یہ کہ وہ لوگ میری بات بہت مانتے ھیں "۔ اور چہرہ کی متانت حکمت سے بڑھکر زھد تک پہنچ گئی اور سنجیدگی راسخ تر ھو گئی اور ایک لمبی مٹار لے کر سلسلہ کلام جاری رکھا " اور بھئی ، وہ یوں ، کہ میں ایک بھٹکی ھوئی ، گم کردہ راہ ، بے زبان لڑکی سے وعدہ کر چکا ھوں ، اب جیسے بھی ھوگا اسکی مدد تو کرنی ھی ھے ، گھر واپس پہنچاؤں گا ۔ اور روبراہ کراؤنگا ۔ اور آپ جانتے ھیں کہ سر دست فوراً تو جا نہیں سکتا جب یہاں دھلی کے کام سے یکسوئی ھو جائے تو پھر "

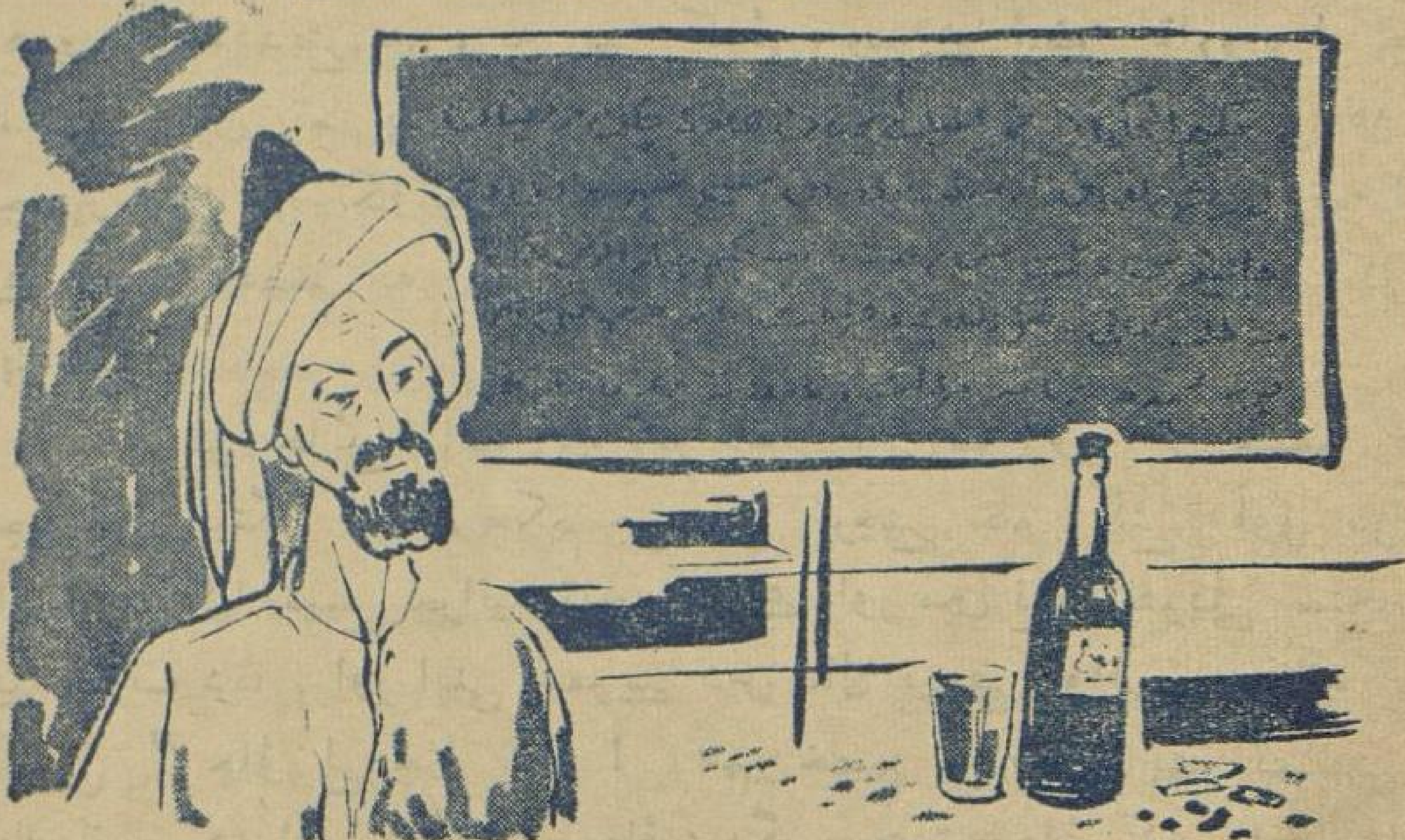
" خیر وہ تو سمجھ گیا مگر میں یہ پوچھتا تھا کہ پھر ھمارے دوران قیام دھلی میں یہ کہاں رھیگی ؟ "

حکیم جی نے مجبوری کے تیور بناتے ھوئے جواب دیا " بیچاری رھتی کہاں ، میرے ساتھ ھی رھیگی ، اور ھاں اب مجھے قیام بھی اب وھاں نہیں کہیں اور سوچنا ھو گا محض اس کی وجہ سے "۔ اور میں نے پھر مزاحیہ سنجیدگی سے کہا ۔ " مگر حکیم جی میری اس بات کا یار تم نے جواب نہیں دیا ، یہ اس ساڑی کی شان نزول کیا ھے ! یعنی وہ ، یہ کہ رات اچھی خاصی لہنگا شال میں گٹھڑی بنی چھوڑ کر سویا ھوں ، پھر ، آں ، اوں ، یہ کے بجے ؟ ، اخیر رات شاید ، ؟ نور ظہور کے وقت ایں ، ؟؟ ۔ اور حکیم جی پھر سنبھلے اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ بات آئی گئی کرتے ھوئے داڑھی چھو کر بولے " وہ یوں کہ اس حلیہ میں اسے میرے ساتھ دیکھکر ھر کس و ناکس کی نگاہ اٹھتی ، لہذا میں نے کہا کہ یہ ساڑی تیرے پاس ھے ، غسل خانہ میں جا کر باندھ لے اور یہ کپڑے اتار دے "

" خیر وہ تو میں سب سمجھ گیا کہ غسل خانہ میں جا کر اتارے ھوں ، شاید صبح ھوتے ابھی ، ایں ؟ باتیں اسی سٹ پر یہ چھوڑو اس قصے کو وہ ھوئی سو ھوئی خیر اب پتے کی بتاؤ یار ، اسے لے کہاں جاؤ گے ؟ "

" ھوں ، یہ تو ابھی رائے قائم نہیں کر سکا ھوں کہ یہ کہاں رھیگی ، بھر حال آپ چلئے مجھے اپنا پتہ سمجھاتے جائیے وھیں نا پنڈت کے کوچہ میں ، بس میں آج ھی سہ پھر میں آپ کے پاس پہنچ جاؤنگا "

'' جی یہ بھول ہے '' میں نے جیسے آدھے کے شریک والے ضابطہ کے تیوروں سے کہا '' یعنی سٹیشن پر پہنچ گئے اور ابھی ٹھہرنے کی جگہ نہیں سوچ پائی ہے۔ اور آپ تو وہاں جا رہے تھے بلیماران ایجنٹ کے ہاں '' اور اب کی مرتبہ حکیم جی اور بھی بغلیں جھانک گئے نبض، ٹٹول کر قارورہ کے پار جانے والی نگاہ میں خشونت کے آثار نمایاں ہو گئے اور پھر تیور ایسے ہو گئے کہ



جیسے پچھتا رہے ہیں کہ کہاں ساتھ ہو گیا تھا بے ایمان کا، ۔ کچھ کہتے بن نہ پڑا، نظریں سنبھال کر ذرا ترچھی کیں، ایک گھونٹ لے کر درست سے ہوئے اور رکھائی کے ساتھ بولے '' کیا فرما رہے ہیں جناب !، میرا اور آپ کا کیا ساتھ ؟، آپ اپنا راستہ لیں، میں جہنم جاؤنگا آپ کو مطلب ؟ ! ''

'' مطلب یہ کہ حکیم جی یار دیکھو سیدھی سیدھی بات کرو، تم نے لہنگا اتروا کر ساڑھی تو بندھوادی اور یہاں ہم سوتے ہی رہے، اب مطلب پوچھو تو یہ ہے کہ پھر یہ ساڑھی بھی اس مقطع داڑھی اور مسجع اچکن کے ساتھ نہیں کھپتی، اس کے لئے تو برقع ہو دبیز نقاب والا، تام لوٹ کٹ، تھنو مارکہ، شٹل کارک صورت، ۔ ورنہ اس حلیہ میں تو یہ سوٹ والے کے ساتھ چل سکتی '' ۔ اور میں نے اپنی ٹائی کی باسی ناٹ درست کرتے ہوئے تن کر اس کی جانب دیکھا اور سلسلہ کلام جاری رکھا '' بس رات جو ہو لی سو ہو لی، اب تو یہ اینجانب کے

ساتھ ٹھہرے گی"

اور حکیم جی بھنا گئے "کیا مطلب ہے جناب کا! یعنی آپ مجھے متہم کر رہے ہیں! لاحولا ولاقوۃ! اسی درہ کی در مجھ پر ورنہ پھر متہم کرنے والے پر!!" — میں نے حکیم جی کے شرعی شرعی سہارا لئے ہوئے بے ڈھب تیور دیکھکر اپنے تاؤ کو عامیانہ مذاق میں ڈھالا اور کہا "واہ بیٹا حکیما واہ!! ہمیں غوطہ دیتے ہو، یہ بھی کوئی وہ ہے نبض قارورہ! جس مکتب میں تم پڑھے ہو اس کی اینٹیں ہم نے ڈھوئی ہیں۔ چاہیں اسی درہ لگاؤ چاہیں سنگ سار کراؤ، پھر یہ مرغی تو اب ہے اکسا ہضم نہ ہونے دونگا"۔ اور میرے تیور کڑے پڑ گئے۔

"تو جائیے آپ کیا کر لینگے؟ آپ اس کے خصم ہیں جو چھین لینگے؟"۔ حکیم جی بھی ترچھے ہو گئے اور سونہہ ایسا ہو گیا جیسے چرانیہ تلخ پیا ہے اور میں نے زہریلی سنجیدگی سے جواب دیا، اور اپنی عمر سے دس سال پیچھے والی بچکانہ بات کہی "جاؤ لے جاؤ بچہ! ہم خصم نہیں تو پھر تم بھی تو باپ نہیں ہو اس کو تم لے جاؤ، مگر سمجھتے جاؤ کہ ابھی اسی وقت یہیں سٹیشن سے بڑے حکیم جی کو چوبیس لفظ کا تار آڑاؤنگا کہ صاحبزادہ یہ کرتوت کر رہے ہیں اور آج ہی رات میں بڑے حکیم جی یہاں دھرے ہونگے، اول تو پکڑے ہی جاؤ گے اور اگر نہیں ریڈ ہینڈڈ پکڑے گئے تو معاملہ تو بگڑ ہی جائیگا اور پھر میں جو تمہارے سونہہ پہ بڑے حکیم جی کے رو در رو حلف اٹھا کر سب پرت اکھیڑ کر رکھ دوں گا۔ اور یہی مت سمجھنا بیٹا حکیم جی کہ بات نہیں رہ جائیگی تم مجھے جانتے ہو ڈھنڈوریا ہوں ڈھنڈوریا گھر لوٹ کر سارے شہر میں پھونک دونگا، ساری حکیم بھول جاؤ گے میاں، سب عزت اور پرکٹس مٹی میں ملا دوں گا۔ یہ بھی کوئی اور وہ ایسا ویسا سمجھا ہو۔" اور میں تلوار کی طرح سنت گیا حکیم جی ویسے تو میرے ہم عمر اور ہم مکتب تھے مگر سنجیدگی میں میرے دادا سے بڑھے ہوئے تھے اور دکانداری میں میری سات پشت سے زیادہ طاق تھے۔ گویا میں نے ان کے

اوپر اس وقت تڑاتڑ گولیوں کی بوچھار کردی ۔ یک دم ڈھیلے ہو گئے ، بدن کے کپڑے سنبھالنے سے مگر جیسے اترے سے پڑ رہے ہیں ، چہرہ کا رنگ فق ہو گیا ، جیسے کچھ بن نہ پڑی اور اک ذرا ذرا سراسیمہ سے ہوئے مگر جیسے ڈھال گئے بڑے بے تکلف انداز میں بڑھکر پیار کے ساتھ میرا ہاتھ دبا لیا اور تیور پوری طرح ہموار کر کے مسکراتے ہوئے بولے " واہ یار واہ ! تم تو خفا ہو گئے ! ہوں کیا بات ہے ، جاؤ تم ہی لے جاؤ سالی کو ۔ چاہے جہاں رکھو ، پھر دوست کہیں ایسا نہ ہو کہ نہ میری ہو اور نہ تمہاری ۔ اور مفت میں یہ سونے کی چڑیا ہاتھ سے اڑ جائے ، میرا مطلب یہ ہے کہ اس کی مرضی بھی معلوم کرلو اگر خوشی سے پہلے تمہارے ہمراہ جانے کو تیار ہو تو مجھے مطلق اعتراض نہیں ، ویسے سمجھ لو کہ بہت بھڑکی ہوئی ہے ، ساری رات ریاض کیا تو کہیں صبح ہوتے رام ہو پائی ۔ ذرا بدک گئی تو سمجھ لو کہ گئی ہاتھ سے پھر نہ توکو نہ موکو ، لے چولہے میں جھونکو " ۔ اور پھر ذرا اپنائیت کا انداز بنا کر کہا " اور میاں ہم نے کسی سالی کو قبالہ تو لکھا نہیں ہے ہاں اتنی سی بات تھی کہ سفر میں یہ دو چار دن اچھے کٹ جاتے ۔ ہم بھی اپنا رستہ پکڑینگے ، جس نے بھگایا تھا وہی اپنے رستہ گیا ، نہ ہم نے بھگایا ہے نہ کسی سالی کا ٹھیکہ لیا ہے "

" ہوں ۔ آں ، ہاں ، یہ بات ٹھیک ہے " میں نے اطمینان کے ساتھ کہا ۔

" تو پھر باہر چلو ، واں ، ادھر مسافر خانہ میں علیحدہ بات کرینگے " حکیم جی نے مخصوص پٹے باز کی طرح پیترا سا بدلا اور ہم سب چل دیئے ۔ پلیٹ فارم سے ریل سے اترے ہوئے مسافر نکل چکے تھے ، پل چڑھ کر ہم دوسری جانب پہنچے آگے آگے میں اور حکیم جی ، پیچھے پیچھے قلی اور درمیان میں ذرا الگ تھلگ سی وہ ، اخیر سیڑھیوں پر حکیم جی نے پانوں کی ڈبیہ نکال کر ایک پان کھایا اور ذرا ایک ساعت کو ٹھہرے اور اتنے میں وہ حکیم جی کے برابر آ گئی اور شاید چلتے ہی چلتے حکیم جی نے اس سے گن سے ایک دو لفظ کہے اس رازدارانہ

بھنبھناہٹ پر مجھے ذرا حیرت سی ہوئی اور حکیم جی تیزی سے دو سیڑھیاں اتر کر پھر میرے برابر آ گئے ۔

تھرڈ کلاس کے مسافر خانہ کے پاخانوں کے پیچھے وہ ، میں ، اور حکیم جی ہم تینوں جمع ہوئے اور حکیم جی نہایت ہلکی سی معمولی چلتی سی بات کرتے ہوئے بولے " دیکھو بھگونتی ، یہ میرے دوست ہیں ، میں نے تمہیں رات بتایا تھا نہ ، بس تم انہیں یہی سمجھو کہ میں ہی ہوں ، ۔ تو میرا مطلب یہ ہے کہ اب تم دو روز ان کے ساتھ ٹھہرو اور تیسرے روز تمہیں گھر پہنچا دیا جائیگا "

اور وہ تو اچھل پڑی ۔ بیکس لاچار ، غریب الوطن ذراسی لونڈیا نے شدید انداز بنایا اور اچھل کر حکیم جی کی آڑ لے کر جا کھڑی ہوئی اور لگی بسورنے ۔ حکیم جی نے پھر کہا ، وہ ایک ہی بات ، سمجھیں ، دو روز ۔"

اور وہ تو سسکیاں بھرنے لگی اور آہستہ مگر نہایت ہی مضبوط سی آواز میں کہا " نہیں ، نہیں ، نہیں ، ان کے ساتھ نہیں ، اور تم نے ریل میں کہا تھا کہ میرے ساتھ رہوگی ، اوں ، اوں "

" ہیں وہ کوئی بات نہیں ، تم انہیں بھی یہی سمجھو کہ میں ہی ہوں ، ایک ہی بات ، حکیم جی نے مخصوص طرز کے ساتھ کہا ۔

" نہیں ، نہیں " اور رونے لگی ۔

" بھگونتی دیکھو ضد نہیں کیا کرتے ہیں ، اس وقت مصلحت یہی ہے " ۔ حکیم جی کچھ ایسے پر معانے انداز میں کہا جیسے بھگونتی ان کی گودی کی کھیلی ہوئی ہے ۔ مگر وہ تو ٹھنک کر حکیم جی کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی مجسم انکار بنی " نہیں نہیں ، نہیں ، آوں ، آوں ، آوں " اور مجھے اس کے اس انداز پر تعجب ہوا ، یا الٰہی رات بھر میں حکیم جی نے اسے کیا گھول کر پلا دیا ۔ اور اس نے تو حکیم جی کا ایک ہاتھ پکڑ لیا اور بازو سے چمٹ کر کھڑی ہو گئی اور حکیم جی شاید میرے سامنے یہ محسوس کر کے کہ وہ حکمت ' طب فلسفے ' ایکما ، اور فقہ و حدیث کے دبیز علاقوں سے نکل کر بیچ بازار ننگ

دھڑنگ کھڑے ہو گئے ، جلدی ھاتھ چھڑا کر دو گز پرے ہٹ گئے ۔

اور جیسے حکیم جی نے مجھے دھکا سا دیا کمر پر زور سے لات ماری ، ۔ مجھے شدید احساس شکست ھوا ایک لمبی سانس لے کر چہرہ پر رومال پھیرا ۔ اور چٹیل بندر کی طرح مونہہ بنا کر آهسته سے کہا " چھوڑ دیا حکیم جی ، ہم کب کسی سالی کو ساتھ لے جانے کو تیار ھیں " ۔ مگر میری آنکھیں حکیم جی سے چار نہ ہوتی تھیں ۔ شاید میرے احساس شکست کا اندازہ کر کے حکیم جی پچکارتے سے انداز کے ساتھ اپنے نرم ھاتھوں میں میرے ھاتھ دبائے اور مجھے دو تین قدم علیحدہ کو لے گئے راز دار تیوروں سے بولے " دیکھو میاں یہ اس وقت تو تیار ہوئی نہیں ۔ مگر کل تک آ جائے گی راہ راست پر اور اس وقت تو میں اسے احمد بائی کی سرائے میں لیکر ٹھہروں گا اور تم کہاں قیام کرو گے " میں نے بسورتے بچے کی طرح کہا " میں بھی وھیں " اور میرے اندر جو جوش رقابت بھڑک رھا تھا وہ شکست کی جھنجھلاہٹ اور محرومی کے رنج میں تبدیل ھو گیا اور بے اختیار ڈھار مار کر رونے کو جی چاھا ۔ حکیم جی نے مجھے بھانپ کر ناصحانہ انداز میں کہا " نہیں تم وھاں نہیں ، تم کارونیشن ھوٹل میں ٹھہرو ، قریب کے قریب اور علیحدہ کے علیحدہ ، ھے نا ، اور دو ایک روز میں یہ اپنے آپ آجائیگی راہ راست پر ، اور ویسے تم چاھو اس دوران میں تو وقت بوقت میرے کمرے میں آتے جاتے رهنا ۔ پھر دیکھا جائیگا ۔ چاھیں کچھ کر لینگے خواہ تم میرے کمرے میں سو رھا کرنا اور میں ھوٹل میں تمہارے کمرے میں جا پڑا کروں گا ۔ دیکھا جائیگا ، آپنے تو اسے راہ راست پر لانا ھے ورنہ اگر ذرا بھڑکی اور گئی ھاتھ سے ، یہ اتنا بڑا شہر ، قبول صورت اور نوجوان لڑکی ، سینکڑوں للی ھمدرد اٹھ کھڑے ھونگے " ۔

اور حکیم جی نے ایک کے بجائے دو تانگوں کو آواز دی ، اگلے تانگے میں خود بیٹھے اور پچھلے والے میں آسے تنہا بٹھایا اور چل پڑے دونوں پیچھے کے پیچھے میں سونگھتا سا ، پچکارے کتے کی طرح تیسرے تانگے میں چلا ، ۔ پہلے احمد بائی کی سرائے آئی ، حکیم جی اور وہ وہ دونوں وھاں اتر گئے اور میرا تانگا کارونیشن ھوٹل کی جانب

بڑھتا رہا ۔ چند قدم بڑھ پایا ھی تھا کہ حکیم جی نے ٹھہرنے کا اشارہ کیا ، میں نے تانگا ٹھہرا لیا اور حکیم جی لپکتے ہوئے بڑھے۔ مجھے تانگے سے نیچے اتر آنے کا اشارہ کیا ۔ اور میرے بالکل قریب آ کر سر گوشی میں کہا '' بھئی پردیس کا موقع ھے مسافرت میں میں یہ رقم اپنے پاس نہیں رکھنا چاھتا خاص طور پر ایسے حالات میں، یہ تم رکھ لو ، پھر جب کل ول جب تم یہاں آجاؤ تو اپنی اور میری سب رقم مجھے دے دینا ، ھے نا ، ؟ خرچ کے لئے میری جیب میں چالیس روپیہ ھے'' ۔ اور یہ کہکر جیب سے نکال کر پرس میرے ھاتھ میں دے دیا اور پھر بولے '' گن تو لو سو سو کے دس نوٹ ھیں'' ۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا ، بھرے بازار میں ھزار روپیہ کھولتے جھجھک سی لگی اور کہا '' ھزار ھے نا ؟ ''

'' ھاں ھزار ، گن لو گن ، دس نوٹ۔'' حکیم جی نے تاکیدی لہجہ میں کہا ۔ اور ان کے اصرار پر میں نے ذرا آڑ سی کر کے پرس کھولا ، اور بغیر نکالے پرس کے اندر ویسی ھی گڈی بنے بنائے دسوں نوٹوں کے کنارے گن لئے اور پرس جیب میں رکھ لیا ۔

اور حکیم جی جیسے میرے لئے نسخہ کا سربراہ تجویز فرما کر اور خود حب مقوی کھا سرائے میں چلے گئے ۔

(۴)

پندرہ سولہ گھنٹہ کے مسلسل سفر کی تکان ، اور جاگنے کی ھڑکل کے باوجود ہوٹل میں پہنچکر مجھے نیند آنا تو درکنار بستر پر کل بھی نہ پڑی ، ۔ سہ پہر کو غسل کر کے اور کپڑے بدل کر حکیم جی کی جانب گیا ان کا کمرہ گوش محل قسم کا ایک گھونچ میں کو تھا ، دروازہ مقفل پایا ، پلٹ آیا ، تھوڑی دیر ہوٹل میں آ کر پھر آرام کیا ۔ رات کا کھانا ٹھیک مغرب بعد کھا لیا اور پھر حکیم جی کی جانب گیا کمرہ جوں کا توں مقفل پایا ، اور دروازہ کی جاء وقوع ایسی علیحدہ کو تھی کہ کسی اور کے پڑوسی ہونے کا موقع ھی نہ تھا، حکیم جی کے کمرے کا دروازہ اور پیش دروازہ علیحدہ ایک جانب کو تھا جب تک

قصد کر کے انہیں کے پاس کوئی نہ جائے وہاں پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اور میں پوچھتا بھی تو کس سے ، اپنا سا مونہہ لے کر چلا آیا ، کہاں غائب ہو گئے ! ، تیسرے ہی پہر سے آج ! ؟ " اور کچھ سمجھ میں نہ آیا ، ۔ تھوڑی دیر بستر پر لیٹا رہا ، بار بار گھڑی دیکھی ، کپڑے نہ اتارے تھے ، حتیٰ کہ جوتا بھی نہ کھولا تھا ، بچھونے پر اسی طرح کسا کسایا لوٹیں لگاتا رہا ، اور ڈیڑھ دو گھنٹہ بعد یکدم لیٹے ہی لیٹے جست سی لگا کر کھڑا ہو گیا ، تالا اٹھا کر کمرہ مقفل کیا ، اور چل دیا ۔ اور اب تو اور بھی حیرت بڑھ گئی حکیم جی تو اب بھی غائب تھے کمرہ بدستور مقفل ، میں نے ناامید ہو کر قفل کھینچا کواڑوں کو آہستہ سے دھکا دیا اور بیکار سی اضطرابی حرکتیں کر کے چلا آیا ، ۔ ہوٹل پہنچکر کپڑے اتار دئیے اور اور روشنی گل کر کے بستر پر لیٹ گیا ، ہلکی آونی چادر لپیٹ لی ، تمام دن قاعدہ کی رو سے آرام کرنے کا تھا مگر ذہنی انتشار ، اور تلاش میں ہوٹل اور سرائے ، اور ہوٹل حکیم جی کے کمرے سے اپنے کمرے تک اور اپنے کمرے سے حکیم جی کے کمرے تک چڑھتے اترتے کٹا تھا ، اور سفر کی تکان کے باوجود نیند غائب تھی ، آنکھیں بند کر کر کے بہتیرا منائی ، منے نہ منی پھر نرم نرم گرم گرم تکیوں کا رانوں اور پنڈلیوں میں سہارا لیا ، مگر بستر پر تو روڑھے سے اٹھ آئے تھے اور پھر تو بےجان ٹھنڈے تکیہ رہی سہی نرمی بھی کھو بیٹھے تھے اور ساری رات آنکھوں آنکھوں میں کٹ گئی کروٹیں بدلے ٹھنڈی سانسیں بھرتے اور پچھلے پہر کو یہ حال ہو گیا جیسے بستر پر کانٹے بچھا دیئے ہیں فجر کے وقت اک ذرا جھپکی سی آئی ، آنکھ کھلی تو دھوپ پھیل چکی تھی ، اور سامنے کی کھڑکی سے ترچھی ترچھی کرنیں میرے بستر پر پڑ رہی تھیں ، اور جیسے دماغ کے ساتھ بدن کی رگ رگ پر وہی چیز طاری تھی ۔ جلدی سے اٹھا ، غسل کیا ، چائے پی ، اور کپڑے بدل کر سیدھا سرائے چل دیا ، اور حکیم جی کا دروازہ تو بدستور مقفل تھا اب کی مرتبہ میں سرائے کے پھاٹک میں پہنچکر دفتر کی کوٹھری میں گھس گیا اور مینجر سے دریافت کیا ، مینجر کچھ بھی نہ بتا سکا اور ایک لونڈا بلا کر سامنے کھڑا

کر دیا جو حکیم جی کے کمرہ کا انچارج تھا ، ۔ کہاں ہیں یہ صاحب ، تیرہ نمبر والے " میں نے پوچھا ۔

" ابھی ذرا دیر ہوئی چلے گئے " اس نے نہایت معصومیت سے جواب دیا ۔

" ہوں ۔ اور رات کس وقت آئے تھے "

" کوئی دس بجے "

" دونوں ساتھ ساتھ "

" ہاں "

" اور اس وقت بھی ساتھ ساتھ گئے ہیں "

" ہاں "

اور میں یہ خیال کرتا ہوا کہ حکیما سالے کے پر لگ گئے ، لئے لئے پھرتا ہے ، رات سینما گئے ہونگے ، اب جمنا کی سیر کرانے لے گیا ہوگا ۔ یا نہ معلوم کہاں کہاں ، پرانی عمارتیں دکھانے لے گیا ہو ، بڑا بھرپور چنگل پڑا ہے ، سالی کو . . . " اپنے کمرہ میں پہنچا اور شغل میں ایک رسالہ پڑھنے کی کوشش کی پڑھتا کیسا ، داخلی بے چینی میں کبھی بستر پر لیٹ گیا ، کبھی کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر کمرے سے باہر نکل کے برامدہ میں ٹہلنے لگا ، ۔ دوپہر ہو گئی بھوک غائب ، بیرا کھانا رکھ کر چلا گیا ، "مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے پیٹ میں لوٹا بھر نمک ملا کھولتا پانی بھرا ہے ، عجیب سا ہیجان . . . . . " اوں کھانے کا وقت ہے ، ٹھیک ، بس اس وقت ضرور آئے ہونگے" ۔ اور میں کمرہ بند کر کے چل پڑا ، مگر حکیم جی کا کمرہ تو اس وقت بھی بند تھا ۔ " سالا حکیما مزے کرتا پھرتا ہے ، لئے لئے ۔ اب گن کھلے اس کے ، کیسا ثقہ بنتا تھا ؟ اونہ ! اور میں چلا آیا ۔ سوچا کہیں اور جاؤں ، وقت کاٹنے اور رات تو رات یہاں تو دن بھی کاٹے نہ کٹتے دکھائی دیتا تھا ، دلی کے بھرے شہر میں :-

اور اپنے کمرہ میں پہنچکر میں نے دو چار ٹھنڈے نوالے اتارے ، جیسے کسی اور کے مونھہ سے ، ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا ، کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکایا ، اور بغیر پتلون اتارے بستر پر لڑھک سا گیا آنکھیں بند کر کر کے بار بار کھولیں مگر سکون کہاں ، مجھ پر تو سفر سا سوار تھا . . . . وہ رات اور ڈیڑھ

دن کی پوری روداد دماغ تو دماغ نس نس پر اتر چڑھ رہی تھی۔۔۔ ایک عجیب سی ذہنی و دماغی اینٹھن ،۔۔۔ اور نظر منٹ منٹ پر کلائی پر جاتی تھی۔ ساڑھے تین بجے بیرا چائے رکھ کر چلا گیا میں نے جلدی سے اٹھکر ایک پیالی چائے سڑوپی ، اور مونہہ پر دو چار مرتبہ ھاتھ پھیر کر کوٹ گلے میں ڈالتا کمرے سے نکل آیا ، اور لپکتا ھوا سیدھا حکیم جی کے دروازہ پر پہنچا اور قفل تو دور ھی سے نظر آگیا مونہہ کی سی کھا کر پلٹا ، سرائے میں ادھر آدھر اوپر نیچے اس چھوکرے کو تلاش کیا مگر نظر نہ آیا ، سیڑھیاں سی گنتا نیچے اترا ، پھاٹک میں پہنچ کر دفتر کی کوٹھری میں جھانکا ، اور منیجر بھی غائب تھا ، کسی چلتے پھرتے نوکر سے منیجر کو پوچھا، نہ معلوم وہ کیا کہتا چلا گیا ، اور میں دھکے سے کھاتا نکل آیا ،۔ باھر سڑک پر نہ روئے ماندن نہ پائے رفتن سا محسوس کرتا چلا آیا ، اور جاتا کہاں ، وھی اپنا ویران کمرہ جس کی تنہائی کاٹنے کو دوڑتی تھی ـ ـ ـ ـ ـ ـ گریزاں ، فروزاں ، بریاں ، پراں ـ ـ ـ ـ صبح کے بعد دوپہر ، سہ پہر اور پھر شام ـ ـ ـ ـ ـ اور شام کو پھر وھی طواف کوئے جاناں ـ ـ ـ ـ ـ ـ اور رات کے دس بجے تک دو مرتبہ اور ، ــ اور وھی بےنیل حرام واپسی ، ــ گیارہ بجے با دل نا خواستہ پھر دو نوالے ، زھر مار کئے ، اور کپڑے اتارے ، بستر پر لیٹ گیا ، اور آج تو شروع شب سے ھی انگارے بچھ گئے تھے ، نیند کیا خاک آتی ، لیٹنا ھی دوبھر تھا ، پہاڑسی رات کٹ ھی گئی ، جسم اپنے کانٹوں کے بچھونے پر اور روح حکیم جی کی سجی سیج کے گرد طواف کرتی رھی ، ــ تصور اپنے کمرے سے اتر اتر کر حکیم جی کے کمرے تک چڑھتا رھا ۔ اور بھانت بھانت کی تصویریں اندھیرے میں سامنے تھرکتی ، پھڑکتی رھیں مرغ کی پہلی بانگ پر بستر سے اٹھ کھڑا ھوا ،۔ سرھانے سے پتلون اتار کر ٹانگوں میں ڈالی اور بغیر ایک کلی بھی کئے کوٹ اٹکاتا مونہہ پر ھاتھ پھیرتا چل پڑا ، اور حکیم جی کا قفل تو اس وقت بھی بند تھا ! ، ــ میں دروازہ پر سر سا ٹکرا کر پلٹ پڑا ــ یا الٰہی حکیم جی تو رسالہ مست قلندر کا معمہ بنے ہوئے ھیں !! سرائے میں چہل پہل شروع نہ ھونے پائی تھی ، ایک

آدھ صبح تڑکے کی گاڑیوں کے مسافر آجا رہے تھے کچھ نوکر پلیگی چوھوں کی طرح رینگ رہے تھے اور انہیں میں مجھے وہ چھوکرا نظر پڑ گیا، اور جیسے کچھ کنی سی کاٹنے لگا، ۔
" ادھر آبے" میں نے اسے ھاتھ کے جھٹکے دار اشارہ کے ساتھ پکارا، وہ ذرا سٹ پٹا کر کھڑا ھو گیا، اور میں نے مخصوص انداز میں پوچھا " ابے کہاں چلے گئے ؟! — اور تو بھی کل سے نہیں ملا"

" اچھا کمرے میں نہیں ھیں !؟ ۔ رات تو تھے ۔ آپ کے جاتے ھی آ گئے تھے"

" ابے تو مجھے رات کب ملا ھے"

" ھو، ھو، حضور نے مجھے نہیں دیکھا تھا، آآاور میں نے حضور کو دیکھا تھا، پھاٹک سے نکلتے، باورچی خانے میں کھڑا تھا" اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا اور میں نرم پڑ گیا ۔

" دیکھو تو بھئی اس وقت تو وہ صبح ھی صبح غائب ھیں، بھلا اتنے صبح کہاں چلے گئے اور رات تم کہتے ھو تم نے انہیں میرے جانے کے بعد دیکھا تو پھر اس کے معنی یہ ھوئے کہ پھر کہیں رات ھی میں چلے گئے، ایں ؟"

" اب مجھے یہ کیا معلوم" اس نے بچکانہ بھولے پن سے کہا ۔

" کھانا تو یہیں کھاتے ھیں ۔"

" اوں، اوں، آں، مجھے نہیں معلوم"

" ابے سالے اڑتا ھے، بڑا بھولا بنتا ھے، کمرے کا کام تو تو کرتا ھے اور معلوم کسے"

اور وہ تو واقعی گھیگھلا سا تھا، گھگھیا سا پڑا اور بولا " نہیں حضور میں کھانا نہیں، کھانا تو کوئی اور، کبھی کوئی کبھی کوئی، میں تو صفائی جھاڑو کرتا ھوں" ۔ اور نوکر بہت کم چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے سوچا تھوڑی دیر بعد آکر منیجر اور نوکروں کو جمع کر کے معلومات کروں گا تو یہ معمہ حل ھوگا ۔ پھاٹک سے باھر نکلتے ھی منیجر نظر پڑا اور میں نے برجستہ سوال کیا " ارے بھئی یہ ھمارے دوست

کہاں گئے ؟ تیرہ نمبر والے !" ۔

" وہ مولانا ۔ ہاں وہ تو اس دن سے دکھائی ہی نہیں پڑے"

" مگر وہ رات تو آئے تھے دس بجے کے بعد"

" اچھا ، مگر میں نے نہیں دیکھا حالانکہ بارہ بجے تک یہیں سامنے دفتر میں بیٹھا رہا ہوں اور بارہ کے بعد پھاٹک بند کراکر سیٹ سے اٹھا ہوں ، آمد روانگی لکھکر ، اور بارہ کے بعد کی اب بھروں گا رجسٹر میں ، ممکن ہے میری نگاہ نہ پڑی ہو ، اس چھوکرے سے پوچھئے ، ابے کدھر گیا رمضنیا" ۔

" وہی تو کہتا تھا ۔ آئے تھے اور اس وقت نہیں ہیں"

" اچھا ہو سکتا ہے صبح تڑکے کہیں اٹھ گئے ہیں"

" اتنے سویرے کہاں ! — اور ہاں یہ تو بتائیے کھانا تو وہ آپ ہی کے یہاں سے کھاتے ہیں"

" ابے رمضنیا کہاں چلا گیا سالا ۔" انہوں نے پھر آواز لگائی دیکھئے بتاتا ہوں"

ہوں ، وہ ، تو مجھے ابھی ملا تھا ، مگر کہتا تھا کہ کھانا اور نوکر لے جاتے ہیں ، اسے کچھ نہیں معلوم"

بکتا ہے سالا بابوجی ، ہم تو زنانہ کمروں میں کسی نوکر کو نہیں جانے دیتے ، یہی لونڈے سب کام کرتے ہیں ، ۔ رمضنیا ۔ ارے رمضنیا ! کدھر ہے ، خیر میں ان کا حساب دیکھکر بتادونگا چھوکرا نہ معلوم کدھر ہے ، سرائے ابھی چلنا شروع ہوئی ہے ، آدمی آنے پائے نہیں ، آپ ذرا ٹھہر کر تکلیف کریں ۔ سب معلوم ہو جائیگا مجھے تو وہ پھر دکھائی نہیں پڑے"

(٥)

میں سڑک پر چلا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ریل میں جو رات کے وقت معمہ سامنے آیا ہے وہ اس وقت تک الجھتا ہی چلا جا رہا ہے ۔ بھلا حکیم جی بھی معمہ بن گئے ۔ پھاٹک پر بیٹھے ہوئے ۔ منیجر کو آتے جاتے دکھائی نہیں دیتے ۔ چھوکرا کہتا ہے موجود نہیں ، کمرہ خالی ، یاالٰہی کیا راز ہے ؟! کس وقت آتے جاتے ہیں ! اور پھر کہاں جاتے ہیں ، اور جیسے

میرے پیٹ کے اندر تندور سا بھڑبھڑا پڑتا مگر اس غصہ میں بھی ایک پہلو نیم مذاق کا کچھ رومانٹک سا جھلکتا رہتا۔ مل جائے موزی حکیما! پھر میں ہوں اور وہ، ٹیٹوا پکڑ کر بیٹھ جاؤنگا۔ ریاکار کہیں کا جھوٹا! — بھلا کیسا ایجابت کا وقت تھا جب ریل میں آنکھ کھلی تھی تہجد کی نماز کے لئے مکار کی! آج تک قبولیت ہی قبولیت ہوئے چلی جارہی ہے ....

.... اور میں اچھل پڑا پیچھے سے میری گردن میں کسی نے ہاتھ حمائل کردیئے، قہقہہ کے ساتھ بھرائی آواز گونجتی "پکڑے گئے نا آج!" مڑا تو چچا مرحوم نے مجھے لپٹا لیا، چچا مرحوم جیتی زندگی چچا مرحوم، ہزار زندوں سے زیادہ زندہ جگ چچا، نہ صرف اولاد بلکے بھائی بھتیجا، بہن بھانجے سگے رشتہدار قسم کی ہر نعمت سے محروم، پھر بھی پیکر خلوص مجسم محبت ہی محبت۔ چھوٹی ہستی کے کمانے والے تاجر، پرلے درجہ کے یار باش، خوب کھانے اور خوب کھلانے والے لوگ، کوئی دوست آشنا ملنے والا ہاتھ آجائے تو خاطر تواضع کی انتہا کردیں کسی دوست کے یہاں پہنچ جائیں تو بھرپور تواضع کا حق ادا کرا لیں، چونکے پسماندگان کے سلسلے سے محروم تھے لہذا ہر سال جیتی زندگی دونوں میاں بی بی اپنے ہاتھ سے اپنے سویم، چہلم، چھ ماہی اور برسی وغیرہ کی فاتحہ کرایا کرتے۔، قوالی ہوتی، مساکین کو کھانا تقسیم ہوتا یار دوستوں کی دعوتیں ہوتیں۔

"کیوں بھتیجے بہادر! یہ کیا حرکت! یعنی چار دن سے چچا مرحوم کے کان چاپ پر لگے ہیں اور آنکھیں دروازہ پر! اور میاں خط تو تمہارا ایک دن پہلے ہی مل گیا تھا، سوچتا تھا کہ کیا ہوا۔ اس دن نہیں تو دوسرے دن آجاتے، اور خیر اگر چلے نہیں تھے تو کارڈ ڈالدیتے، اب دو دن سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ چل بھی دیئے اور آبھی گئے مگر یہاں کہیں اور ٹھہر گئے۔ کارتوسوں والے حافظ جی کی دکان پر بھی دریافت کیا اور بندوق والے حاجی جی کے کارخانہ میں بھی پچھوایا،۔ ہوں اور انہیں کے یہاں سے ہر سال مال جایا کرتا ہے، کہیں سراغ نہ ملا سوچا نہ معلوم کس چکر میں ہیں، دن رات ہر گھڑی انتظار ہی تھا۔ کیوں، کہاں پھنس گئے؟ کسی خاص دوست کے ساتھ؟"

...اور چچا کے مونہہ سے الفاظ سوالات اور پھر جوابات کا آبشار سا جاری تھا اور میں نے دل میں کہا " جب تو نہیں اب ضرور پھنسا آپ کے چنگل میں " ۔ بھوت کا پکڑا چھوٹے چچا مرحوم کا پکڑا نہ چھوٹے ! مجھ پہ سناٹا سا بیت گیا، اس وقت کی ایرا پھیری سے گئے اور رہی سہی امید پر پانی پھر گیا ۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ چچا مرحوم کی بانہوں میں نہیں مسان کی پکڑ میں جکڑا ہوا ہوں اور میں تو چچا کے لوہے کے شکنجہ جیسی گرفت سے خوب واقف تھا " اور میں تو آج ہی تمہارے گھر کو لکھنے والا تھا کہ اطلاع دیکر کیوں نہیں پہنچے ۔ اچھا کہاں ٹھہرے ہو ؟ " چچا نہ معلوم کتنے جملے بول گئے مگر میں اس پر چونک پڑا اور میں کچھ ہکلایا تو ضرور مگر بولنے سے پہلے ادھر ہاتھ اٹھ گیا اور " کارونیشن ہوٹل " مونہہ سے نکل گیا ۔

" ہوٹل !؟ ایں ہوٹل کیوں ؟!" اور چچا مرحوم کی تعجب سے پھٹی آنکھیں پہلے کارونیشن ہوٹل کی بلند عمارت تک اٹھیں اور پھر میرے اوپر جم کر جواب سا طلب کرنے لگیں " کیوں !؟" اور پھر مستغرانہ انداز شدید تر کرتے ہوئے کہا یہی تو میں پوچھتا ہوں کہ گھر سے چل کر راستہ میں ایسی کون سی بات ہو گئی جو ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا بہر حال وہاں سے ہوٹل کا منصوبہ بنا کر چلے نہ تھے ورنہ مجھے کیوں لکھتے "۔ اور میری آنکھیں جھک گئیں ، چچا مرحوم میرے گھر بھر کے محبوب دوست تھے اور ہر سال میں دو چار مرتبہ آکر قیام کرتے تھے ، اس وقت مجھ کو ان کا وجود چور کو کوتوال شہر کے وجود سے کم خطرناک نہ معلوم ہوا ۔ کوئی جواب تلاش کر رہا تھا چچا نے ہتھوڑا سا مارا " تو پھر چلو گھر ۔"

" چلو ! " کی آواز میرے کان پر گولی سی سنسنائی ، اور بڑی مشکل سے جواب نکلا " ہوں ، آں ، نہیں ، اچھا ، میں آجاؤنگا "

" جی ! کیوں ؟ آ کب جاؤ گے ، چلو "

" جی ہاں ، وہ ، د ۔ ک ، کوچھ ، کچھ کام ہے "

" یعنی وہ کون سی مہم ہے جس میں چچا مرحوم کی مدد دلی کے اندر درکار نہیں ہے ، اور آنجناب اکیلے سر کرنا

چاہتے ہیں، ابھی کارتوس تو نہیں خریدے ہیں، ایں، اب کی میں دلواؤنگا، خاص اپنی معرفت، میری بات ہو گئی ہے ایک نئی دکان سے، پارسی نے ابھی کھولی ہے، نیا لائیسنس لیا ہے، دام ہر جگہ سے کم اور مال بیس . . . .'' چچا مرحوم باتیں کرتے اور میرا ھاتھ پکڑے بڑھتے رہے، اور میں نے ان کا رخ پہچان کر کہا '' تو پھر کہاں چل رہے ہیں؟''

'' ہوٹل اسباب اٹھانے ''

'' تو آج اور چچا، نہیں کل آجاؤنگا'' میں نے خوشامد سے کہا۔

'' یعنی کل کیوں؟ جی نہیں ابھی چلنا پڑے گا،۔ تم مجھکو اطلاع دے چکے ہو اپنی آمد کی، اور اس حساب سے میرا مال منقولہ ہو دلی کے اندر میاں ''

'' اچھا چچا شام کو، شام کو، میں شام کو چلا آؤنگا چچا کے سر کی قسم'' میں نے کہیں اور کسی ہوٹل میں جا چھپنے کے خیال سے شام تک کی مہلت مانگی '' یعنی شام تک آپ کیا کیمیا بنا لینگے یہاں ہوٹل میں، اور مفت میں آج کا دن اور لگ جائیگا،۔ معلوم ہوتا ہے ابکی مرتبہ فالتو رقم زیادہ لائے ہیں، ارے بابا پھونکنا ہے تو جنگل میں پھونکیو، یہاں کارونیشن ہوٹل میں کیوں مفت گانٹھ کٹاتے ہو'' اور جیسے وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے سے ہوٹل کے دفتر میں پہنچ گئے۔

'' بل بنا دیجئے منیجر صاحب آپ کا ''

'' میں نے کہا'' نہیں چچا بس آج، آج اور چھوڑ دو، تمہیں میرے سر کی قسم'' میں نے چچا مرحوم کی مسان جیسی گرفت کو جاننے کے باوجود چھوٹنے کی آخیر کوشش کی۔

'' نہیں کچھ نہیں سنی جا سکتی، اور جیب سے نکالکر دس دس کے دو نوٹ منیجر کی میز پر رکھدیئے اور بولے '' کیا لینا دینا ہے منیجر صاحب '' اور منیجر نے جلدی جلدی بل بنا کر پانچ روپیہ واپس کئے او چچا مرحوم بڑبڑائے یہ مجھی پر پڑے اب گھاس لیٹ اور بھینسے کے گوشت کے اور کھٹیا بھر جگہ کے مفت میں گھر چھوڑ ہوٹل میں آ پڑے بھلا دیکھو تو'' اور پھر بل دیکھکر بولے '' اچھا دس نمبر کمرہ، اوپر، اور میں پیچھے

پیچھے وہ آگے آگے کھٹ کھٹ اوپر چڑھتے چلے گئے اور آناًفاناً میں اسباب لپیٹ لپاٹ ایک نوکر کے سر پر رکھوا کر نیچے اتر آئے۔

مگر چچا ایک قباحت رہگئی وہ حکیم جی حکیموں کوچہ والے بڑے حکیم جی کے صاحب زادہ میرے ساتھ تشریف لائے ہیں، آج تین دن ہو گئے اپنی ہزار روپے امانت میرے سر منڈھ کر غائب ہوگئے۔ اور وہ مجھے تلاش کرتے ہوئے یہیں آئینگے"

"یہ تو یک نشد دو شد" لاحولا ولا قوۃ میاں پردیس میں پرائی امانتیں باندھے پھرتے ہو، یہاں اپنا ہی وجود بھاری ہے، ۔ اور چار پان سو روپیہ اپنا ہو گا ایں ؟!"

"ہاں" میں نے کہا۔

خوب میاں، ہو نا لڑکے، اور ڈیڑھ ہزار کی رقم باندھے باندھے آپ دلی شہر میں پھرتے ہیں اور رات کو اکیلے اس کمرہ میں سوتے ہیں، میاں صاحبزادہ یہ دلی ہے دلی! ذرا دیر میں دن دھاڑے رستہ چلتے آنکھوں سے سرمہ پونچھتے ہیں جیب کترے، ایسا صفائی کا ہاتھ مارتے ہیں ۔ ہوں، ۔ مہینہ پیچھے دو چار کیس ہوٹلوں کی واردات کے سننے میں آتے ہی رہتے ہیں، ۔ دشمنوں، جان کی جان مفت میں اور رقم تو خیر ۔"

"اسی لئے تو میں کہتا تھا کہ آج دن میں حکیم جی کا کھوج لگا کر ان کی امانت اُن کے حوالے کر دیتا اور پھر شام کو آپ کے یاں ---"

"جی نہیں یہاں دن رات سب برابر ہیں ۔ اور یہ رقم باندھے تو آپ کو میں منٹ بھر اکیلا نہ چھوڑونگا۔ حکیم جی کے لئے منیجر صاحب کے پاس پرچہ چھوڑو، اور میرے گھر کا پتہ دیدو، لب سڑک مکان ہے جب ضرورت ہوگی آپ پہنچ جائینگے، اب اس وقت گھر چلو، معلوم ہوتا ہے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا ہے، سر جھاڑ مونہہ پہاڑ صبح ہی صبح نہ معلوم کہاں نکل پڑے معلوم ہوتا ہے ساری رات تھیٹر دیکھا ہے --- گھر چلو نہا دھو کر کپڑے بدلو، ناشتہ کرو پھر میرے ساتھ چلنا کارتوس تو میں پسند کر لینا، اب تک سب دوکانوں کا بھاؤ تو لے چکے ہو گے، اگر پٹے تو سودا کر لینا ۔ بیکار میں رقم باندھے باندھے پھرنا ٹھیک

نہیں پردیس کا موقع سمجھو ذرا"
اور چچا نے ایک تانگا روک لیا اور اسباب کے ساتھ لاد چلے۔

(٦)

اور چچا مرحوم کے ساتھ میری توجہ ہی ہٹی۔" کچھ صبر سا آیا، اور چچا مرحوم تو ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے ساتھ ایک فضا سی باندھے پھرا کرتے ہیں،۔ خوب کھانے اور خوب کھلانے والے بزرگ، ساتھی، یار، سبھی کچھ، پھر آٹھوں گانٹھ کھیت تاجر، دکان دکان کی چیز دیکھی، بھاؤ لیا، آخیر پر پارسی کی نئی دکان پر لے گئے۔ پہلے چپکے سے اپنا پچیس فیصدی کمیشن ٹھہرایا، بھاؤ بازار سے سستا اور اچھا سامان خریدوایا باھر نکل کر کمیشن کی رقم میرے ھاتھ پر دھر دی اور بولے " یہ لو، ہم تمہاری اس آتش بازی کے تو قائل نہیں ہیں، اس کا سوٹ بنانا۔ اور کہو تو کپڑا بھی پسند کرادوں، سوٹ کے کمیشن سے ٹائیاں خرید لینا۔، میں ھنس پڑا اور کہا "چچا مرحوم ابھی تو تمہارے ھوٹل کے بل والے پندرہ روپے میرے ذمہ ہیں"۔

اس کی فکر نہ کرو، چچا مرحوم رہ جانے والے لوگ نہیں ہیں، کمیشن میں سے پہلے ھی وضع کر کے تمہارے ھاتھ میں دیئے ہیں بھلا آئیے پارسی کے یہاں سودا لینے ھوٹل کا بل چچا مرحوم ادا کرتے!۔ اور ھوٹل سے گھر تک کے تانگے کے پیسے بھی اسی سالے پارسی سے لئے۔ یہ دیکھو پندرہ روپیہ آٹھ آنہ اور اپنی جیب پر ھاتھ مارا " پہلے ھی رکھ لئے ہیں"

" خوب!" میں نے خوش ہو کر کہا۔

" ارے میاں چچا مرحوم سے ملے رہو گے تو ہزار بلاؤں سے دور رہو گے، اور فائدہ ھی فائدہ میں رہو گے"

اور میں نے دل میں کہا " ابھی تو بڑے خسارہ میں ہیں"۔ اور ایک ٹھنڈی سانس بھری، اچھی بلا سے دور ہوئے — بھر پائے آپ کی پناہ و تواضع سے"

اور چچا مرحوم کے ساتھ دو دن گذرے پہلا دن تو خیر خریداری میں کٹ گیا، مگر دوسرا کاٹے نہ کٹتا تھا حالانکہ

چچا سایہ کی طرح میرے ساتھ لگے تھے اور ہزلہ منجبوں اور خوش گپوں کے مارے شمار نہ تھا ۔ صبح کے چھٹے کہیں رات کو گیارہ بجے اٹھ کر اندر گئے ۔ میں بستر پر دراز ھوکر آدھی رات تک چچا کے بھوت سے پیچھا چھڑانے کی ترکیب سوچتا رھا ، آدھی رات گذرے کچھ سوجھی ، گھڑی پر ساڑھے چار بجے کا الارم لگایا اور آنکھیں بند کر کے چادر میں اچھی طرح مونہہ لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا ، ۔ ایک جھپکی سی آئی سفرور سلزم والی اونگھ ، مگر گھڑی کا الارم کوک اٹھا ، اور میں ترنگ سی لگاکر بستر سے اٹھ کھڑا ھوا ۔ چپکے سے جلدی جلدی کپڑے پہنے ، اور بیٹھک کا باھر گلی میں کھلنے والا دروازہ آھستہ سے کھول کر اتر آیا ، اک ذرا آزاد سی ھوا میں سانس لی ، تیز تیز بڑھا یہ سوچتا ھوا کہ اب تو حکیم جی کو فراغت ھو گئی ھو گی ، اور جن جن محرک و مقوی ادویہ کے عملی تجربات سے نابلد تھے ان سے بھی سرفراز ھو لئے ھونگے ۔ شاید خیر خیرات میں کچھ مجھ پر بھی ترس آجائے ۔ ۔ ۔ ۔ کہ گلی کے نکڑ پر بڑے زور کی مٹھار سن کر سہم گیا مٹھار کیا سینہ پر گھونسا سا پڑا اور جب تک گھونچ کی آڑ پکڑوں پکڑ چچا مرحوم چٹان کی طرح میرے سامنے تھے ، مسجد سے فجر کی نماز پڑھکر دعاء رد بلا کا ورد کرتے چلے آرھے تھے ۔ جیسے ریڈھنڈیڈ ۔ چور نقب پر ! ۔ میں کھڑا رہ گیا ، گویا ھاتھوں میں ھتکڑیاں بھی تھیں ! ۔ سوچ کر چلا تھا کہ احمد پائی کی سرائے کا خلوت خانہ ھو گا اور حکیم جی کی جگہ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور چچا مرحوم ڈھونڈتے ھی پھرینگے کہ بھتیجا کدھر گیا ۔ اور ان دو تاریک دن اور اندھیری راتوں میں کہیں پر امید کی کرن نظر آئی تھی تو اس میں کہ حکیم جی کے ٹھہرنے کی جگہ کا چچا مرحوم کو پتہ نہ تھا اور احمد پائی کی سرائے کے نام کی ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی ، اور کہاں کیا کیا ھو رھا ھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! کچھ نہ معلوم تھا ۔

” اماں خیر توھے ! کہاں ؟! ایں ؟ صبح ھی صبح ۔ جیسے ایک ھی جملہ میں [illegible] ،ات کی بنی بنائی اسکیم پر پانی پھیر دیا ۔

اور بھلا میں اتنے صبح ایسے جواب کے لئے تیار کیوں ھوتا ۔

کیا خبر تھی کہ چچا مرحوم اس وقت مسجد کے جن کی طرح نکل کر مجھکو دبوچ لینگے، بڑے زور سے ھکلا پڑا "چ چ چ چا چا، چچا و، و، وہ بھئی میں حکیم جی کے روپیہ دینے جا رہا ہوں، مفت میں پرائی امانت کا بار، ہوں آپ ٹھیک کہتے تھے"

" ھاں وہ تو خیر ٹھیک ھے مگر میرا مطلب یہ ھے کہ یہ کون سا وقت ھے؟! - چائے پی کے ناشتہ واشتہ کر کے اطمینان سے چلینگے، - اور ھاں تم تو کہتے تھے کہ تمہیں ان کا پتہ ھی معلوم نہیں پھر اس وقت جا کہاں رھے تھے، صبح ھی صبح، - کیا کوئی خواب دیکھ لیا رات؟! ایں! دواخانہ بھی نہیں کھلا ھو گا اتنے سویرے" - چچا کے مونہہ سے تڑاتڑ کھلتے ہوئے لفظوں میں سے " اطمینان سے چلینگے " پر میں سہم کر رہ گیا 'زبان کو لگام دی' اور مفراسی میں سمجھا کہ کان ڈالے دم ھلاتا پچکارے پلے کی طرح پیچھے پیچھے ھو لوں، "اچھا تو ٹھیک ھے ناشتہ کر کے جاؤنگا" - میں نے چچا کے آخری جملوں کا جواب ھضم کرتے ہوئے اور چلینگے" کی جاؤنگا" تصحیح کرتے ہوئے کہا -

ھاں میاں مونہہ ھاتھ دھو کے ناشتہ کر کے جانا اطمینان سے میں بھی چلا چلوں گا تلاش کر لینگے، پھر تم بھلا اس وقت جا بھی کہاں رھے تھے ان کا کوئی ٹھیا مقام تو ھے نہیں، کہاں ڈھونڈھتے ایں؟" اور میرا حلق روندھ سا گیا چچا کی بات سنی ان سنی کر کے اڑادی، اور ایسے موقع پر تو بات بدلنے کے لئے بھی زبان کو بات نہیں ملا کرتی - اور مجھے ھکلاتے ھی ھکلاتے بڑے زور سے کھانسی آ گئی اور کھانس کر فارغ ھوا اور چچا نے بیٹھک میں پہنچکر حقہ پر پہلا کش لگایا تو دھوئیں میں گھٹی ہوئی پہلی آواز یہی نکلی اور اب کی مرتبہ نہایت وضاحت کے ساتھ، رو در رو " ھاں تو میں پوچھ رہا تھا کہ تم اس وقت کس جگہ جا رھے تھے حکیم جی کے لئے" - لیکن اتنی دیر میں میرے دماغ کے گوبر کے اندر بھی کیڑے بجبجا گئے تھے، برجستہ جواب دیا " جی ھمدرد دوا خانہ، یا تو وہ خود ھی مل جائیں گے ورنہ پتہ تو مل ھی جائیگا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے، دے آنا جاکر" چچا نے کہا اور میری جان میں جان آئی اور کہا " جی ہاں، دے آؤں اور سوچتا ہوں آج ہی رات کی ٹرین سے چل بھی دوں"

خیر یہ تو بیکار بات ہے نہ آج رات کی ٹرین سے نہ کل اور نہ پرسوں چلنا چلانا نہیں ہو سکتا ابھی ہاں تم حکیم جی کی امانت جاکر انہیں سونپ آؤ، چائے وائے پی کے اطمینان سے اور اتنے صبح تو کوئی دوا خانہ بھی نہ کھلا ملتا اور ہمدرد دواخانہ تو اور بھی دن چڑھے کھلتا ہے مفت میں چل پڑے تھے دحشت میں مونہہ اندھیرے" اور حقہ کا ایک لمبا کش لے کر سلسلہ کلام جاری رکھا، "لو اب اٹھو، حجامت بناؤ، مونہہ ہاتھ دھوؤ، چاہو تو غسل خانے میں جاکر دو لوٹے پانی بہالو، اتنے میں چائے آئی جاتی ہے، ۔ اطمینان سے جانا آدمی بن کر بھاڑ میں جائے حکیم جی کی امانت میرا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ تم اسے ایسا تن سے لگالو ایسا ہی بوجھ تھا مجھے دیدیئے ہوتے اندر ڈال دیتا"

اب مجھے واقعی اطمینان سا تھا، چچا مرحوم کو لومڑی کی سی دھچی دے لی تھی اور دعا مانگ رہا تھا کہ حکیما ظالم ہاتھ آجائے تو پھر بات بنے ! اور آج بات بننے کی قوی امید تھی نہ معلوم کیوں اگرچہ صبح ہی صبح چچا مرحوم نے راستہ کاٹ کر ان‌سلیٹ کردی تھی پھر بھی یقین سا تھا، اور جب میں نے شگون لیا تو سیدھا نتھنا چل رہا تھا اطمینان سے شیو کیا، مزے لے لے کر غسل کیا، اپنا بہترین ٹڑا پیکل سوٹ پہنا، اچھی طرح کریم اور سینٹ ملا اور ہم رنگ رومال اور ٹائی لگائی بڑے سٹائل کے ساتھ فیلٹ ہیٹ لگایا اور آئینہ کے سامنے نہ معلوم کتنے بل کھا گیا اور سب سے اندر والی جیب میں بحفاظت حکیم جی کا ہزاری بٹوا رکھکر، چائے پر آگیا خوب ناشتہ کیا اور چائے کی دوسری پیالی ختم کر رہا تھا کہ سڑک والے دروازہ سے احمد پائی کی سرائے کا ایک نوکر آیا اور حکیم جی کا دستخطی پرچہ مجھکو دیا ۔

برادرم، آپ میری امانت لیکر فوراً چلے آئیے فقط

حکیم جبارالدین بقلم خود عفی عنہ

کارونیشن ہوٹل سے پکڑے ہوئے مفرور قیدی اب تو جب

میں چھوڑوں جبھی چھوٹ سکتے ہو آنا جانا کیسا ؟ جناب ۔ آمدن بہ ارادت و رفتن بہ اجازت اور یہاں تو اسکا بھی کوئی سوال نہیں ھے آپ مہمان تو ھیں نہیں جناب بلکہ مال غنیمت ھیں میںنے پرچہ پڑھتے ھی نوکر کو فوراً ٹالا ” تم جاؤ ھم ابھی آتے ھیں “ جب نوکر چلا گیا تو میری جان میں جان آئی ۔ چچا حقہ کے پیہم کشوں میں گم تھے ورنہ براہ راست سوال کرتے ” کہاں سے آئے ہو “ اور وہ برجستہ یہی کہتا احمد پائی کی سرائے سے ، ۔ اور بنی بنائی بات بگڑ جاتی ۔ خیریت گذری ۔ اور چچا نے اس کے جاتے ھی کہا ، چلا گیا ۔ کسکا پرچہ ھے حکیم جی کا ؟ ۔ دواخانہ سے بھیجا ھوگا جی ھاں وہ واں میرا انتظار کر رہے ھیں میں نے آھستہ سے کہا اور بات بن گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۷)

میں ڈرامائی انداز میں تیندوے کی سی جست لگا کر ٹھیک سے یکدم گلی میں آپڑا ۔ اور بغیر پیچھے مڑکر دیکھے اور چچا سے بغیر رسمی رخصت لئے لپکا کہ کہیں چلتے چلتے ساتھ چلنے کی پخ نہ لگا دیں اور سڑک پر پہنچکر دم لیا ، ایک چلتا تانگا روکا اور بندر کی طرح اچھل کر سیٹ پر جا بیٹھا ۔ آھستہ سے کہااحمد پائی کی سرائے ۔ اور پھر شاید میں نہیں آتش نہیں شوق اندر سے بولی تیز چلو ، ۔ اور میں نزدیکی وصل کے احساس کے ساتھ تصور کی فسوں‌کاری میں گم ھو گیا ۔ جیسے رنگینیوں ھی رنگینیوں میں حل شیش محل در شیش محل تعمیر کرتا چلا جا رہا تھا ۔ حکیم جی بات کا پکا نکلا خیر ایک کی جگہ پانچ دن ضرور لے لئے ، پھر کیا معلوم وہ ھی نہ تیار ھوئی ھو ۔ اور بیچارہ بیگناہ ھو ، بہر حال دیر آید درست آید ، صبح کا بھولا شام کو آھی گیا ۔ اور جیسے میرا دل زور زور سے دھڑکھتا ۔ سینہ میں طوفان سا ٹھاٹھیں مارتا کانوں میں ارغنوں سے بجتے اور لب آپ ھی آپ گنگنائے سے پڑتے تصور کی فسوں‌کاری ۔ ۔ ۔ اور پھر ناک میں بھینی بھینی خوشبو سی آتی ۔ سوندھی

سوندھی جیسے کوری صراحی میں پانی پڑنے کے بعد "تیز چلو اندر سے پھر گرم گرم تھرتھراتی آواز نکلی - شڑاشڑ شائیں سے گھوڑے پر ھنٹر پڑا ھر چیز ارغنو سا ھی بھاپ بھلی سنائی پڑ رھی تھی - تانگے کے پھیئے ساز سا بجا رھے تھے، ٹاپوں کی آواز تالیاں سی گونج رھی تھیں اور دل کی رفتار تو گھوڑے سے بھی تیز تھی - میل ڈیڑھ میل کالے کوس بن گیا - " ارے بھئی تیز چلو" اور گھوڑا تو ساتھ بھی نہ دے سکتا تھا یہاں تو خلوت خانہ میں پہنچ بھی گئے - - - حکیم جی نے خود ھی یاد فرمایا تھا - - - - - زھےنصیب ! - - - - -

تانگا سرائے کے پھاٹک پر پہنچا - اور میں نے کارونیشن ھوٹل کو بھی اتنا نہ پہچانا تھا جتنا احمد پائی کی سرائے کو - دن تو خاصا چڑھ آیا تھا مگر سرائے میں سناٹا تھا مسافروں کی چلت پھرت سست سست سی - نہ نوکروں کی دوڑ ڈھوپ نہ چھوکروں کا شور شغب - اور اپنی دھن میں مست اوپر لو لگائے آگے آگے بے خودی پیچھے پیچھے ھوش بڑھتا چلا گیا اور ایک سانس میں پورا زینہ چڑھ گیا - اور حکیم جی کے کمرہ پر پہنچکر تو خوف کے مارے میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں ! آج کمرہ کا دروازہ کھلا ھوا تھا اور پیش دروازہ پر بھیڑ لگی تھی جس میں دس بارہ لال پگڑیاں دھک رھی تھیں یک دم گھبرا کر پلٹنا چاھا اور پھر آگے بڑھنا، مگر نہ یہ کر سکا نہ وہ اور جب دوسری نگاہ ذرا سنبھال کر ڈالی تو جیسے بڑی دور تک ٹھوکر کھاتی چلی گئی چار کانسٹیبلوں کے درمیان حکیم جی بیٹھے تھے ھاتھوں میں ھتھکڑیاں پہنے اور باگ‌ڈور ایک ھیڈ کانسٹیبل کے ھاتھ میں تھی ایک جانب ذرا علیحدہ کو وہ چھوکرا مرغا بنا ھوا تھا کچھ تماشائی آس کے پاس کے مسافر اور چند اجنبی پولیس کے پیٹنٹ گواہ جو ایسے موقع واردات پر سر بمہر ساتھ جایا کرتے ھیں اچھی خاصی برات سی سجی ھوئی تھی

وہ آگئے مجمع میں کوئی گن سے بولا اور سارے مجمع کی نگاہ اٹھ گئی ایک بوڑھا اور ایک نوجوان وہ پیترا کاٹتے پولیس آفیسر میری جانب بڑھے مگر بڑے میٹھے قدموں -

اور وہ مسکرا رہے تھے اور خالی ہاتھ بھی تھے مگر فطری طور پر میں ڈرا ۔ اور گھبرا کر ان کی جانب دیکھا ، تو نوجوان افسر تو میرا اس شیرینی سے استقبال کیا جیسے چاندنی چوک کے دکاندار لپک کر اپنے گاھک لیا کرتے ھیں ۔ اور بوڑھے کی نگاھوں میں وہ کیفیت تھی جو لائق داماد کے سسرال پہنچنے پر خسر کی ھوتی ھے ۔ سلام پیش دستی کرتے ھوئے دونوں نے گرم جوشی کے ساتھ ھاتھ ملایا ، اور اپنا تعارف پیش کیا ۔

" میں تھانہ دار انچارج تھانہ چاندنی چوک " نوجوان نے کہا اور بوڑھے نے کہا " میں کوتوال شہر ھردوئی "

مگر اس سب کے باوجود میرا خون خشک ھو گیا ۔ اور جب انہوں نے انتہائی نرمی اور بھائی چارہ کے انداز میں برابر کے کمرہ میں چلنے کو کہا تو میں بہت گھبرایا ، اور کمرہ میں پہنچ گئے ، بوڑھے کوتوال شہر نے کھچڑی مونچھوں پر ھاتھ پھیرا اور اس انداز سے جیسے پرانا مہاجن اپنی خوش دھند آسامی کو دیکھتا ھے میری جانب دیکھا ، اور سگریٹ بڑھائی ، میں نے سگریٹ سلگائی اور اپنی سگریٹ سلگا کر انہوں نے نہایت ھی رازدارانہ آواز میں کہا " آپ سمجھ گئے ، ان آپ کے ان دوست حکیم جی پر ۳۶۳ ، ۳۶۵ ، ۳۷۹ جرم ھیں ۔ سیشن کیس "

" جی جی کیا ، ان کا کیا مطلب ؟ " میں نے سینہ سے اٹھتے ھوئے خوف کی پیہم لہروں پر قابو پا کر کہا ۔

" کڈنیپنگ ، اغوا ، چوری حبس بےجا ، زنا بالجبر " ۔ تھانہ‌دار نے کہا ۔ اور بوڑھے کوتوال نے پھر مہاجن کی طرح ھاتھ پھیر کر مونچھیں نیچی کر لیں اور تھانہ دار کے مونھہ سے بات لے کر کہا وہ تو سب کچھ ھے ، چھوڑو ، معاملہ حکیم جی سے طے ھو گیا ، آپ ان کا ھزار روپیہ لائے ھیں ؟ ، بات ھمارے ان کے مابین ھو گئی "

" ج ، ج ، جی آں ، ناں ، اوں کیا ؟ "

بوڑھے کوتوال نے مدھم اور میٹھی آواز میں کہا " میاں آپ بالکل نہ پریشان ھوں ، دیکھئے آپ سے کوئی مطالبہ نہیں ھے نہ قانونی اور نہ کیسا ھی ، شرافت شرافت کو پہچانتی

ہے ہم بھی شریف ہیں اور آپ لوگ بھی شریف خانداں معلوم ہوتے ہیں ، ویسے تو جرائم بہت سنگین تھے مگر حکیم جی کی شرافت پر نظر کرتے ہوئے ہم نے خود ہی خیال کیا ، ان سے سب بات طے ہو چکی ہے اور ابھی پرچہ بھیجکر آپ کو بلایا ہے ، بس آپ ہی کی دیر تھی ، ہوں ، وہ ان کی رقم ہمیں دیدیجئے "

" اوں ، نا ، آں ، ہاں ، خیر ، مگر وہ میں ذرا ان سے بات کر لیتا " میں نے اس غیر متوقع سے سوال پر ذرا سنبھلتے ہوئے کہا اور تھانہ دار نے بڑی نرمی کے ساتھ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مخصوص انداز میں کہا " آپ مفت میں دیر کر رہے ہیں وہ بیچارے شریف آدمی ، حکمم جی ، بیکار میں بندھے بیٹھے ہیں ، اور ہمیں تو شریفوں کی عزت کا خود ہی بڑا پاس ہے ، ورنہ کارونیشن ہوٹل سے آپ کے پتہ لے کر ہم خود ہی پہنچتے ، نوکر کیوں بھیجتے ، ایں ، بس اسی لئے تو " ۔ اور مجھے اس کے ہاتھ کی نرمی میں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کپاس کے ٹیٹ بھرے ہیں اور ذرا زیادہ دبانے سے بنولے چبھنے لگینگے اور ساتھ ہی ساتھ اندازہ ہوا کہ ہر وہ پولیس آفیسران حد سے زیادہ بڑھے ہوئے شریف ہیں اور شریف سے زیادہ شریف پرور ، پھر بھی ہمت کر کے کہا " دیکھئے تو ، وہ تو ، سب ہے ، ان کی امانت ان کے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں پہنچی ہے ، اور ہاتھ کو ہاتھ پہچانتا ہے ، ہوں ، میں پہلے ذرا ان سے بات کر لیتا تھانہ دار نے ذرا ترچھا ہو کر کہا " وہ تو سب کچھ ہے ، پھر آپ نے دیکھا نہیں حکیم جی کے ہاتھ میں ہتکڑیاں ہیں ۔ اور ابھی کھلتی نہیں ، ۔ اور اگر آپ نہیں دینگے تو پھر معلوم ۔ ایں ! اور کتنے ہاتھوں میں پڑجائیں ، اوں ، غوں خواہ مخواہ ۔ " اور میرا ہاتھ جلدی سے سکڑ کر تھانے دار کے پنجہ سے علیحدہ ہو گیا اور بے اختیار جیب کی جانب بڑھا مگر مونہہ سے پھر وہی نکلا " بہتر ہوتا آپ انہیں اپنے موجہ میں بلا لیتے ، ویسے مجھے آپ کی بات کا پورا یقین ہے ، پھر بھی میں ذرا روبراہ ہو جاؤں "

اور کوتوال نے ساہوکار والے لہجہ میں کہا " مان لیجئے صاحب ، بات کچی نہیں ہے ہماری ، آپ مفت میں ان بیچارے

حکیم جی کو ذلیل کرانا چاہتے ہیں۔ وہاں سے یہاں یہاں سے وہاں ، اتنے تمام آدمیوں کے روبرو"۔ اور بولتے بولتے ، تیوروں میں سے کوتوال چھلک پڑا "اور سیشن کیس ابھی ابھی یہیں پر ختم ہوتا ہے ورنہ دفعہ نمبر ۲۱۰ ، ۴۲۰ ، ۳۶۶ ، ۳۶۳ ، ۳۴۲ ، ۳۷۶ ، ۳۷۹ ، تعزیرات ہند"۔ دھوکادھی ، چوری ، واشتس ، مال مسروقہ ، اغوا ، کڈنیپنگ حبس بےجا ، زنابالجبر ، ایک چھوڑ سات سات جرائم اور ایک ایک میں سات سات سال قید بامشقت ، ! پھر شرافت کو علیحدہ بٹہ ، یہاں سے وہاں تک بدنامی اور تھانہ‌دار نے لقمہ دیا تو حکیم جی ھی کیا۔ اور آپ ، آپ پر بھی ۳۶۸ چلتی ہے ، اعانت اغوا۔ اور نہیں تو پھر یہاں سے وہاں تک گواھی میں تو کھچے کھچے پھرینگے ، ھائیکورٹ سے کیس جا کر دو برس میں طے ہوگا اپیل"۔

ایک ھی سانس میں ۲۱۰ سے ۴۲۰ تک ہزاروں میزان اور انچاس برس کا لمبا ناپ سن کر بغیرھی مشقت کے مجھے پسینہ آگیا ، مونہہ پر رومال پھیر کر کہا "دیکھئے رقم حکیم جی کی پوری ایک ہزار میری جیب میں ہے ، اور ان کے پرچہ میرے پاس ہے ، اس میں شک نہیں کہ بات آپ کی غلط نہیں ہے ، پھر جب معاملہ پکا ہے تو وہ بھی دور نہیں انہیں بھی بلالیجئے ذرا" اور بوڑھے کوتوال نے میری جیب کی جانب مخصوص نظریں ڈال کر اطمینان سے ہونٹ چاٹے ، اور تھانہ‌دار کی جانب دیکھا اور جیسے کچھ آنکھوں ھی آنکھوں میں بات کی اور پھر پنجابی انداز میں بولے " بھئی لے بھی آؤ۔ اگر صاحبزادہ کی یہی ضد ہے ،۔ اور پھر ھاں ٹھیک ھی کہتے ہیں ، رقم تو ان کی جیب میں ہے یہی نا ھاتھ کو ھاتھ پہچانتا ہے" اور جب یہ اچھی طرح یقین ہو گیا کہ روپیہ جیب میں موجود ہے اور کسی اور کسی الٹ پلٹ کا امکان نہیں ہے تو تھانہ‌دار باھر گیا اور آہستہ سے کواڑ کھول کر حکیم جی کی باگ ڈور پکڑے داخل ھوا"۔ حکیم جی مجھے دیکھکر رو پڑے ، اور ایک ڈیک مار کر سر جھکائے اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے حب مقئی کھا کر اتفراغ ہونے والا ہے ،۔

حکمم جی بیچارے نے قانون تو پڑھا تھا مگر شیخ الرئیس

بوعلی سینا کا لکھا ہوا جس میں گل بنفشے ، عناب ، بیدانہ ، سپستاں کے خواص درج تھے مگر لارڈ میکالے کا لکھا ہوا نہ پڑھا تھا جس میں ۲۱۰ سے ۴۲۰ تک کے اثرات درج تھے ، ورنہ نابالغ لڑکی کو اغوا کر کے سرائے کے کمرے میں بند کرنے ۔ ۔ ۔ ۔ اور نہ معلوم کن کن کروں " کے نتائج کا علم ہوتا ، اور میں نے تو نہ " یہ " پڑھا تھا ، نہ " وہ " ۔ کارونیشن ہوٹل سے احمد پائی کی سرائے تک لپکنا ، اور احمد پائی کی سرائے سے کارونیشن ہوٹل تک دھکے کھانا ضرور کیا تھا ، ۔ اور اسی کئے کو ڈر رہا تھا ، حکیم جی کی صورت دیکھتے ہی جیب سے پرس نکال کر بڑھا دیا ، ۔ اور حکیم جی کے ہاتھوں کے اوپر بیک وقت دونوں پولیس آفیسروں کے نرم نرم پنجے جمع ہو گئے ، اور ہاتوں ہاتھ دسوں نوٹ گن لئے ، ۔ کوتوال نے جیب سے کنجی نکالی ہتھکڑی چھن سے بولی اور حکیم جی کے خالی ہاتھ آزاد ہو گئے ۔ کمرے کی فضا یک دم بدل گئی ، پولیس افسران کے گڑ کی بھیلی جیسے چہروں میں میدے کے حلوے جیسی حلاوت بھی پیدا ہوگئی ، کوتوال نے میٹھے لہجہ اور ہم خیالی کے انداز میں کہا " چلئے اندراج صحیح کرادیں ۔ " ہم چاروں باہر نکلے ، اور حکیم جی کے ہاتھ آزاد دیکھکر ہیڈ کانسٹیبل بڑے زور سے مٹھار اور انتظاماً ایک کراری ڈانٹ نکالی " چلو بھاگو سالو ، ! کیسی برات لگائی ہے ! " مجمع یوں غائب ہو گیا جیسے ھد چڑیاں اڑ جاتی ہیں ۔ تھانہ دار نے ایک لات مرغا بنے چھوکرے کے رسید کی " جا بھاگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ذرا فتنہ سالا ، ! اور تین دن سے ملزم کو تالے میں بند کئے پڑا سب کو نچا رہا ھے " چھوکرا قلابازی کھا کر بھاگ گیا ، اور تھانہ دار نے قانونی سنجیدگی سے کہا " مدعیہ کو تھانہ لے جاؤ " ۔ مدعیہ پر میں نے نظر کی تو ایک کونے میں مونہہ دیئے ، گول گول گٹھری سی بنی بھگونتی بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی ، ۔ جو جنسی اصطلاح کی مدعاعلیہ سے قانونی اصطلاح کی مدعیہ بن گئی تھی ۔ اور وہ تو اور بھی سکڑ گئی جب ہیڈ کانسٹیبل نے آھستہ سے اٹھنے کو کہا ، اور ہیڈ کانسٹیبل نے یہ دیکھکر مخصوص نظریں ڈالتے ہوئے جیسے مونہہ میں گھی شکر گھلی ہوئی آواز میں کہا " اٹھو ، مسماۃ ،

ابھی سے سکڑتی ہو، ابھی تو نہ معلوم کتنا کتنا پھیلو گی، نوکیلی" اور دو سپاہیوں کی جانب دیکھکر آنکھ ماری ایک سپاھی مسکرا کر بڑ بڑا کر "کیسی تڑپ کے اٹھی ہے موقع واردات سے، بجلی سی، دیوار پھاندتے ھی پہلے اسی نے تو مجھے دیکھا تھا"۔

دوسرے نے کہا "حکیم جی تو میں نے بکرے کی طرح دبائے تھے پر یہ تمہارے ھاتھوں میں سے تڑپ تڑپ کے نکل نکل جاتی تھی۔"

"چلو مسماۃ! کیا یہیں بیٹھی رہوگی، لو اب اٹھو، پھر اکٹھی بیٹھ لینا" کانسٹیبل نے مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ بڑے تکلف کے ساتھ بھگونتی اٹھی اور بہت آہستہ کھڑی ہوئی، ملگجی ساڑی میں سنڈمنڈ پونگا سی بنی لپٹی لپٹائی سر سے پاؤں تک کفنی سی پہنے۔ اور کمر پر گانٹھ بھی تو نہ لگا سکی تھی۔ کھڑی ہو گئی، ھیڈ کانسٹیبل نے ٹیڑھے ہونٹ سے مسکراتے ہوئے کہا "اری نیک بخت ذرا اندر ساڑی تو ٹھیک کر آ" کانسٹیبل مسکرایا اور بڑبڑایا "سلوکا پیٹی کوٹ پہن لیا ہوتا بھلی مانس،۔ جا اندر جا کے ڈھونڈ لے" اور جوں ھی بھگوتی کمرے کے اندر کو رینگی موقع واردات پر حکیم جی کو حراست میں لینے والے دونوں سپاھی بے اختیار ھنس پڑے۔

سرائے کے رجسٹر آمد میں اندراج صحیح کراکر دونوں افسران نے حکیم جی کو دکھایا اور کوتوال نے مجھے آواز دی "دیکھ لیجئے نا آپ بھی آجائیے ادھر نام ھی صاف کر دیا سرے سے حکیم جی کا رجسٹر میں سے یہ دیکھئے ورق پھاڑ پھینکا حکیم جی کے نام کا" اور میں نے دیکھا کہ حکیم جی والے خانہ میں بھاگیرت کہار بھرے ہوئے تھے۔ حکیم جی نے بھگونتی کو اپنی مریضہ لکھایا تھا مگر بھاگیرت کہار کے اندراج کے بعد اس خانے میں زوجہ بٹھادی گئی تھیں اور رجسٹر میں نیا ورق ٹانگ دیا گیا تھا۔

"مگر وہ کہاں ہے بھاگیرت کہار" میں نے پوچھا۔

"لیجئے اور آپ سمجھئے کیا اب تک، ارے بھئی اسی سالے کو تو گرفتار کر کے لایا ہوں، یہاں تھانہ میں حوالات کے اندر

حراست میں ھے، اور پانچ دن میں تفتیش یہاں تک پہنچ گئی" کوتوال نے کہا اور پھر مزید احسان سا دھراتے ہوئے میری اور حکیم جی کی جانب دیکھکر سلسلہ کلام جاری رکھا " اطمینان رکھیں شریف آدمیوں کے بچوں کی عزت کے ہم ہمیشہ خیال رکھتے ھیں آپ لوگوں کو گواھی میں بھی نہیں گھسیٹونگا مار مار بھوت بنا دیا سالے کو، اقبالی ملزم ھے، بس اسی سرائے کے منیجر کی شناخت مقدمہ سزا ہو گا" تھانہ‌دار نے لقمہ دیا۔

اور جب تک سرائے منیجر نے اپنا بل بڑھا دیا۔ کچھ ایسے انداز میں کہ وہ بل کی ادائیگی پولیس افسروں کے مواجہ میں چاھتا ھے، جیسے کچھ حکیم جی اور پولیس افسر دونوں سے مخاطب ھے،۔ حکیم جی بغلیں سی جھانک گئے۔ اور میری خانب دیکھا، میں نے آھستہ سے کہا " کیوں، وہ روپیہ، چالیس تو تمہارے پاس ھیں نا" اور بل پر نظر ڈالی تو تیس روپیہ کا تھا " دیدو" میں نے کہا،۔ مگر حکیم جی کو جیسے کچھ کہتے جیسے کچھ بن نہ پڑی اور انکار میں سر ہلایا، میں نے کہا کیا کہہ رہے ہو، " دیدو اور پیچھا کاٹو"

" تو حکیم جی آھستہ سے بولے وہ نہیں رھے"

" کیوں کیا کئے کہیں نکلے نہیں بیٹھے نہیں، آئے نہیں گئے نہیں پھر؟ ایں؟" میں نے محاسبہ سا کیا۔

" ہوں تلاشی میں کانسٹیبلوں نے سب سے پہلے شیروانی کی جیب میں سے نکال لئے کھونٹی پر شیروانی ٹنگی تھی۔"

" تو پھر کہو ان سے" میں نے کہا۔ حکیم جی نے ذرا توقف سا کیا آھستہ سے منھارے اور مجھ سے سرگوشی میں کہا " بھئی انہیں اب چھیڑنا ٹھیک نہیں اور کہنا بے سود ھے دینے سے رھے تم بل ادا کردو ایں ہم پر علم جہاں ہزار وھاں چالیس اور سہی۔" حکیم جی بہت خائف تھے۔

" مگر میں تو کل بازار میں جیب جھاڑ چکا اور بس یہ کھینچ کھنچا کر ریل کا کرایہ تھرڈ کلاس کا۔ یہاں کوچہ پنڈت میں ٹھہرا ہوں کسی کا لینا نہیں دینا نہیں اور وہ تو میں کل ہی چلا جاتا جو یہ تمہاری امانت کی پوٹ نہ دبی ہوتی" میں نے کہا اور حکیم جی بیچارے بلی کا سا مونہہ چلا کر رہ گئے

لاچار حیران میں ہمت کر کے کوتوال کی جانب متوجہ ہوا اور کہا " ارے صاحب اب انہیں چھوڑا ہے تو پھر یہاں سے بھی گلو خلاصی کرائیے ۔"

" یہاں سے گلو خلاصی ہم بھئی ہم کیسے کرائیں ؟"

" مطلب یہ ہے کہ یہ سرائے کے تیس روپیہ دینا ہے اور ان کے پاس کوڑی نہیں "

" تو پھر ہم سے واسطہ ۔" کوتوال نے کہا اور میں نے ذرا اور بحث کر کے کہا " واسطہ یہ کہ تلاشی کے وقت کھونٹی پر ٹنگی ہوئی اچکن کی جیب میں سے چالیس روپیہ بر آمد ۔"

" جی جی وہ سب سن لیا " کوتوال نے رکھائی کے ساتھ کہا ٹھہرے آپ ہیں مزہ آپ نے مارا ہے گلچھرے آپ نے اڑائے ہیں " اور حکیم جی کی جانب تمسخر اور طنز کے ساتھ دیکھا اور سلسہ کلام جاری رکھا اور پھر تھانے دار سے داد سی طلب کرتے ہوئے کہتے رہے یعنی سن رہے ہو بھائی کھایا آپ نے ہے اور بھگتیں پولیس والے سالے ۔

" جی ہاں جی ہاں میں سمجھ گیا بھائی ایک سے ایک چنٹ پڑا ہے ۔ چہ چہ چہ ! کیا دنیا ہے ان سپاہی غریبوں کے چھین لو چالیس روپلی فرمایا نہیں صاحبزادہ نے کہ تلاشی کے وقت اچکن کی جیب میں سے چالیس روپیہ برآمد ہوئے تھے " تھانہ دار نے کہا اور کوتوال صاحب توبہ سی کھینچنے لگے اور آھستہ آھستہ کہتے رہے عبرت کا مقام ہے اور پھر میری جانب حقارت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا " چہ چہ چہ توبہ توبہ غریب سپاہی پانچ پانچ پڑ کے آٹھ ہیں بیچارے "

" وہ کوئی بات نہیں مگر اس وقت سرائے کا بل ادا کرنا ہے "

" تو پھر آپ دیدیجئے قرض "

" میرے پاس نہیں ہیں ورنہ میں یہ نوبت نہ آنے دیتا "

" یہ کوئی یقین کرنے کی بات ہے کہ آپ تیس روپیہ نہیں دیسکتے ۔" تھانہ‌دار نے کہا اور کوتوال نے لقمہ بڑھایا " تو پھر ہم کیا کریں ہم کیا یہاں یہ قضیے نبٹانے آئے ہیں ۔ مگر تھانہ‌دار نے جیسے کچھ پنچاتی انداز میں پڑھا اور

ایک ہاتھ حکیم جی کے اور ایک منیجر کے کندھے پر رکھکر بولا
"ارے بھئی اس میں ایسی کیا بات ھے خدا نکرے حکیم جی ننگے
تو نہیں" او پھر ذرا فیصلہ کن انداز میں سرائے کے منیجر سے
مخاطب ھوا "دیکھو جی حکیم صاحب اپنا اسباب چھوڑے جاتے
ھیں جب تمہارا بل چکا دیں گے اپنا اسباب چھڑا لیجائیں گے ھماری
امانت سمجھو کوئی چیز ادھر سے ادھر نہ ھو تم ذمہ دار ھو"
اور پھر حکیم جی سے مخاطب ھوا "حکیم جی آپ اپنا سامان
ھماری تحویل میں سمجھیں کوئی چیز ادھر سے ادھر نہیں ھو سکتی
اطمینان رکھیں" اور یہ کہکر دونوں چل پڑے منیجر تالا لیکر
بڑھا اور حکیم جی "ٹھہرو ذرا میں کپڑے تو پہن لوں لپکے
ھوئے دروازہ کی جانب چلے - منیجر نے "جی نہیں جی نہیں" کہتے
ھوئے تالا بند کر دیا اور کہا "داروغہ جی کی امانت ھے کوئی
چیز ادھر سے ادھر نہیں ھو سکتی" اور چلنے لگا حکیم جی لپکے
اور کہا "اماں ٹھہرو میں ذرا کرتا پائجامہ تو -" مگر وہ بڑبڑاتا
چلا گیا اور حکیم جی سینڈو بنیان پہنے تہمد کی گھنڈی
پکڑے میرے سامنے سوالیہ نشان کی صورت ننگے پاؤں ننگے سر
کھڑے رہ گئے -

دیوانِ اوّل

کلیاتِ میرؔ

تیسری قسط

صفحہ ۵۷

تا

صفحہ ۸۰